جدید عصری مسائل اور
ان کا شرعی حل

پروفیسر شہباز احمد چشتی
ایم اے ایل ایل بی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

بسم الله الرحمن الرحيم

جدید عصری مسائل
اور
ان کا شرعی حل

پروفیسر شہباز احمد چشتی
ایم اے ایل ایل بی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ٥ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

98117

نام کتاب	جدید عصری مسائل اور ان کا شرعی حل
مصنف	پروفیسر شہباز احمد چشتی ایڈووکیٹ فاضل دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف
زیر نگرانی	قاری اشفاق احمد خان
تاریخ اشاعت	جون 2008ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FM45
قیمت	-/155

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-212011-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- sales@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

......فہرست......

انتساب 5

جدید وقدیم علوم کی حامل شخصیت 7

جدید مسائل اور دینی تعلیمات کی کاملیت 9

اسلام کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل 17

حصہ اوّل

جدید قانونی مسائل اور ان کا شرعی حل

ربا کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ 23

پسند کی شادی کی شرعی حیثیت 42

فون اور انٹرنیٹ پر نکاح کی شرعی حیثیت 50

غیرت کے نام پر قتل کا قانونی وفقہی تجزیہ 58

یتیم پوتے کی وراثت کا اسلامی حل 66

ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی حیثیت 80

حدود آرڈیننس پر اعتراضات کا علمی جائزہ 84

حصہ دوم

جدید تمدنی مسائل اوران کا شرعی حل

پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت 95

خاندانی منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت 104

انسانی اعضاء کی پیوند کاری اور اس کا شرعی تجزیہ 115

بیمہ (Insurance) کی شرعی حیثیت 125

رہن (Mortgage) کے مسئلے کا اسلامی حل 136

رؤیت ہلال (Moon sighting) کا فقہی تجزیہ 155

حصہ سوم

جدید معاشرتی مسائل اوران کا شرعی حل

پردہ کی شرعی حیثیت 186

متعہ کا قانونی وشرعی تجزیہ 211

مسلمان عورت کا مقام اور دائرہ کار 220

انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت 242

دینی مدارس کے نظام ونصابِ تعلیم کا تجزیہ 255

انتساب......

اس مسیحائے قوم، عارف کامل اور دانائے راز
کے نام

☆...... جس نے یاس وقنوطیت کا شکار قوم کو امید کی دولت بخشی۔
☆...... جس نے بھٹکے ہوئے آہو کو سوم حرم چلا کر منزل آشنا کیا۔
☆...... جس کی فکر میں تابانیاں آرنلڈ کی شاگردی نے نہیں رومی کے فیض نے پیدا کیں۔
☆...... جس کی نظر میں نکھار تہذیب مغرب سے نہیں خاکِ مدینہ کا کجلہ لگانے سے آیا
☆...... جس کے پیغام میں دردو سوز میونخ کی یونیورسٹی سے نہیں مکتب عشق سے آیا۔
☆...... جس کی نوک قلم نے صاحبانِ فکر کو زندگی کے مستور حقائق سے نقاب کشائی کا ملکہ عطا فرمایا۔
☆...... جس نے مجھ جیسے طالبعلموں کو اپنی نشتر تحقیق سے ستاروں کے جگر چاک کرنے کا ولولۂ تازہ بخشا۔

میری مراد، مفکر اسلام، قلندر لاہوری، عاشق صادق اور مصور پاکستان

حضرت **علامہ محمد اقبال** رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

اے اللہ! مجھے ان کے قلب ونظر، فکر وتدبر اور سوز وگداز کا فیض بخش دے۔

آمین بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

باسمہٖ تعالیٰ شانہ

جدید وقدیم علوم کی حامل شخصیت

مکرم ومحترم جناب علامہ شہباز احمد صاحب چشتی ایڈووکیٹ (جو وکیل ہونے کے ساتھ ایک مستند عالم دین بھی ہیں) کے فقہی مضامین (جو مختلف جرائد میں شائع ہوکر قارئین کے قلوب واذہان میں جگہ پا چکے ہیں) کو احباب کے پرزور اصرار پر ''عصر جدید کے مسائل اور اسلام'' کے نام سے کتابی شکل میں اکٹھا شائع کیا گیا ہے جس سے افادہ واستفادہ میں آسانی ہوگئی ہے۔

اس سے قبل ایسے موضوعات پر اگرچہ مختلف اربابِ علم ودانش اپنی فکر وتحقیق زینتِ قرطاس بنا چکے ہیں مگر جس سلاست بیان اور آسان پیرایہ اظہار کو اپنایا گیا ہے وہ قابل داد ہے۔

چشتی صاحب کے مضامین سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کوئی جامد مذہب نہیں بلکہ وہ دین حنیف ہے جو قیامت تک پیش آئندہ مسائل اور گتھیوں کو سلجھاتا اور ان کا قابل عمل حل پیش کرتا رہے گا۔ مصنف محترم نے فقہ کے مخصوص انداز اور مشکل زبان والفاظ کو استعمال کرنے کے بجائے عام فہم اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنایا ہے جو ایک مستحسن اقدام ہے۔ تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے مسائل پر مجتہدانہ انداز سے غور وفکر کیا جائے اور اسلاف کرام کی روشن شاہراہ پر چلتے ہوئے ان کے نقوش قدم کو رہنما بنا کر اپنے رہوار تحقیق کو مہیز دی جائے تاکہ شریعت کا مطمع نظر واضح ہو جائے کہ عوام وخواص ان مسائل کے اسلامی حل کو بلا جھجک اپنا سکیں اور ان کا فکر وعمل شک وارتیاب کا شکار نہ ہو۔

دعا ہے اللہ کریم مصنف محترم کی اس کاوش کو قبولیت عامہ عطا فرمائے اور

انہیں بیش از بیش خدمتِ دین کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبہ الکریم علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
میر پور، آزاد کشمیر
پرنسپل کھڑی یونیورسٹی آزاد کشمیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جدید مسائل اور دینی تعلیمات کی کاملیت

از: پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

دین اسلام کے حوالے سے جن بنیادی حقائق کو تسلیم کرنا لازم ہے ان میں دین کی ہمہ گیریت اور تعلیماتِ دین کی کاملیت کا درجہ اساسی ہے۔ ہر اس فرد کو جو اسلام کو اپنے دین کے طور پر تسلیم کرے یہ بھی یقین رکھنا ہوگا کہ یہ دین اس کی انفرادی واجتماعی، معاشی ومعاشرتی اور مادی وروحانی زندگی کی تمام جہتوں کو محیط ہے اور کسی حالت میں بھی اُسے بے خبر یا بے جہت نہیں چھوڑا گیا بلکہ کامیابی وکامرانی کی تعلیمات پر مخلصانہ عمل سے مشروط کر دیا گیا۔ یہ آفاقی اور ہمہ گیر تعلیمات وہ ہیں جو نبی آخرالزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے، ان تعلیمات کو قرآن مجید جو مکمل ضابطہ حیات ہے اور اقوال وارشادات حتیٰ کہ اعمال وافعال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ہر پیش آئندہ مسئلہ کے حل کیلئے اور ہر حائل الجھن کی کشائش کیلئے ان کی طرف رجوع کرنا لازم ہے کہ فوز وفلاح کے تمام راستے انہی مراکز سے پھوٹتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہی ایک ہمہ جہت رحمت کی نوید تھی کہ آپ کی رسالت تمام جہانوں کے ہر ہر فرد کیلئے رحمت کا پیغام ہے۔ فرمایا گیا

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء)

''اور ہم نے آپ کو سارے جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا''۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ تسلیم کرنے والوں کیلئے ہمہ بشارت ہے اور انکار کرنے والوں کیلئے ہمہ انتباہ کا حوالہ ہے، اسی لیے ارشاد ہوا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: ۲۸)

''اور ہم نے آپ کو پوری انسانیت کیلئے بشارت دینے والا اور انتباہ کرنے والا بنا کر بھیجا''۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر اتباعِ رسالت خوشخبریوں کی ضمانت ہے تو انحراف کرنے والوں کے یہ انحراف ہلاکت و تباہی کی وعید بھی ہے۔ یہ اتباع صرف اخلاقی تقاضا نہیں بلکہ یہ کامرانیوں اور ناکامیوں کا معیار بھی ہے اور پھر یہ کہ ہادی اعظم ﷺ کی اطاعت وقتی یا لمحاتی یا عصری تقاضا ہی نہیں ہمیشگی کا لزوم ہے کہ رسالت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے کہ نافرمانی سر بسر گمراہی ہے، ارشاد ہوا:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (ال عمران)

''اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور رسولِ محترم (ﷺ) کی تا کہ تم رحم کیے جاؤ''۔

انسان کی تخلیق کا اوّلین مقصد خالق کی رضا کو حاصل کرنا ہے کہ اُس کی رحمت کے سوا زندگی بے توفیق بھی ہے اور سراسر محروم بھی، اس لئے ضروری ہوا کہ طالبِ رحمت، خالق و مالک اور رسول محترم ﷺ کی اطاعت کو اپنا مشن بنائے اور نافرمانی سے بچے کہ صرف اطاعت شعاری ہی باعث کرم نہیں نافرمانی بھی موجب ضلالت و رسوائی ہے، ارشاد ہوا:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾ (الاحزاب)

''اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرتا ہے تو بے شک وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہے''۔

اطاعت و اتباع کے اس لزوم کو خود رحمت عالم ﷺ نے بڑی صراحت کے ساتھ بیان فرما دیا تھا کہ ابہام یا تاویل کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، فرمایا:

''مَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصٰى مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ

مُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ'' (صحیح البخاری کتاب الاعتصام باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

''جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی کی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی لوگوں کے درمیان نشانِ امتیاز ہیں۔''

اطاعت کی تحریک اور عدم اطاعت سے اجتناب کی ترغیب سے ہی نفس مضمون واضح ہو گیا تھا مگر انسانی ذہنوں کے تمام تر خلجانوں کو دور کرنے کیلئے یہ بھی فرما دیا گیا کہ آپ کی ذات گرامی ہی حق وصداقت کا بنیادی حوالہ ہے۔ امت جب بھی کسی مسئلے یا عمل کی اباحت یا کراہت کے درمیان فیصلہ کرنے میں الجھاؤ پائے گی تو اُس کیلئے فرامین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسوۂ حسنہ ہی کامیابی وفلاح کی ضمانت ہوگا، انسان اگر سلامتی کا طلبگار ہے اور اگر اُسے حیاتِ مستعار کو بامراد بنانا ہے تو وہ کہیں بھی ہو، کسی دور میں بھی زندہ ہو اُسے بہر حال اُسی زندہ جاوید رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ خلاف حکم جو عمل بھی ہوگا وہ کبھی درست عمل نہ کہلا سکے گا۔ صدیوں کے بعد روشنی کا منبع وہی ذات مبارکہ ہے جس نے برملا اعلان کر دیا تھا کہ تم میں سے کوئی مومن نہ ہو سکے گا جب تک وہ اپنی خواہشات اور ارادوں کو اُن احکام کے تابع نہیں کر لیتا جو میں لے کر آیا ہوں''۔ بڑی صراحت سے ہر دور کے مسلمان کو یہ پیغام دے دیا گیا کہ حالات کیسے گھمبیر ہوں، ماحول کا جبر کس قدر شدید ہو، معاشرتی اضطراب کا کوئی عالم ہو اور معاشی گھٹن کتنی ہی جان لیوا ہو، اہل ایمان کو ہر حال میں درِ اقدس سے وابستہ رہنا چاہیے۔ اسلام اس بے غبار وابستگی کا ہر آن تقاضا کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر دور کا مسلم معاشرہ جب بھی بھٹکنے لگا تو اُس نے اُنہیں روشن ایام سے راہنمائی پائی۔ علماء امت نے اس وابستگی کو عقل وشعور کی روشنی عطا کی اور ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل سیرتِ

رسول ﷺ میں تلاش کرلیا۔ یہ سوچ کس قدر مستحسن تھی کہ آفاق پیما مسائل کا حل بھی دراقدس کی جبہ سائی سے ہی تلاش کیا گیا۔

صدیاں گواہ ہیں کہ قیاس و اجتہاد کی قندیل نورِ نبوت سے فیض یاب رہی ہے اسی لیے اجماعِ امت کا ہر استخراج نمود خیر کا باعث بنا۔ ہاں جب اُسوۂ حسنہ کی نورانیت کو مثلیت کے غبار نے اپنے باطن کی تاریکیوں میں مقید کرنا چاہا تو نہ صرف یہ کہ امت مسلمہ بے سمت ہونے لگی بلکہ اس سے خیر و امتیاز کا شرف بھی چھننے لگا۔ ایک صاحبِ نسبت فرد اور ایک حقیقت آشنا عقیدت مند کا شرف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خدمت دین کیلئے وقف رکھے اور یوں شعوری کاوشیں کرے کہ وہ اپنی عقل و فکر کو دربار عالی کے سامنے ڈھیر کردے تا کہ ؎

عقل قربان کن بہ پیش مصطفےٰ (ﷺ)

کی صورت قائم رہے۔

حصار نبوت میں جو فکر بھی پروان چڑھے گی اُس میں روشنی بھی ہوگی اور انکسار بھی۔ وہ اپنی رائے کو عجز کے تمام آداب کے ساتھ پیش کرے گی اور کسی نتیجہ کو انا کا مسئلہ نہیں بنائے گی۔ یہ روش صلحائے امت کا امتیاز رہی اور فقہاء ذی وقار نے اس پر اپنے مودب اور محتاط قدموں سے پیش قدمی کی۔

دورِ حاضر بھی اپنے جلو میں بے شمار جدید اور نوخیز مسائل لئے ہوئے ہے۔ کم فہم، دینی تقاضوں سے بے خبر اور ذات کو صداقت سے افضل گرداننے والے عصر حاضر کو الجھا رہے ہیں اور بدقسمتی سے ان میں کچھ غیر بھی دراندازی کرنے لگے ہیں کہ انتشار کا دور دشمنوں کیلئے سنہرا دور ہوتا ہے۔ آج علماء حق پر واجب ہے کہ وہ حصارِ عافیت سے باہر آئیں اور بدی و بدفطرتی کے متعفن ماحول کو نکہتِ کرم سے عطر بیز بنانے کی سعی کریں۔ بدی منہ بد ہے اس لیے نیکی کو زاویہ نشین ہو کر اس سے بے

اعتنائی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ لاتعلقی گوشۂ عافیت نہیں ہے ایک جرم ہے۔ دین کے احکام سے پہلوتہی ہے۔ ذرائع اشاعت و ابلاغ مسموم ہوتے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نسخۂ کیمیا کے محافظ تریاق بدست کیوں نہیں۔

عزیز مکرم شہباز احمد چشتی کے چند مضامین کا مجموعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو سوزشِ فکر کا کچھ مداوا ہوا۔ میں شہباز احمد چشتی کے ذوق نگارش سے بھی کچھ عرصے سے آگاہ ہوں اور اُن کے اندر کے جذبوں کی تمازت کو بھی دیر سے محسوس کر رہا ہوں۔ دینی مدارس میں مروجہ علوم سے بہرہ ور جوان جدید عصری علوم اور تقاضوں کو بھی جانتا ہے اور یقیناً مستقبل میں دفاعِ اسلام کی ذمہ داری ایسے نوجوان ہی نبھانے کے اہل ہوں گے۔ حیرت ہے کہ محدود فضا میں زندہ رہنے والا وہ وجود جسے دنیائے علم میں حجۃ الاسلام کا لقب ملا، کس طرح فلسفۂ یونان سے بھی بہرہ ور تھا اور ہندی ماورائیت کی ہر رمز سے بھی آشنا تھا، علم اسی ہمہ گیریت کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے دردمند جوانوں کو اپنی ذمہ داریاں سمجھ لینی چاہئیں کہ یہ ان کی ہی نہیں پوری ملت اسلامیہ کی بقا اور عروج کا مسئلہ ہے۔

شہباز احمد چشتی کے مختلف موضوعات کے حوالے سے لکھے جانے والے تیرہ مقالات میرے پیش نظر ہیں۔ ہر مسئلہ دعوتِ فکر ہے اور علماء کی توجہ کا مستحق ہے کہ مسلم معاشرہ ان مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔ اگر ان مسائل پر توجہ نہ دی گئی تو یاد رکھئے ''جائے خالی دیواں گیرند'' کے مصداق خالی الذہن مسلم جوان ان موضوعات پر غلط قسم کے استخراجات کا اسیر ہو جائے گا۔ خالی پیٹ انسان کو کچھ چاہیے تاکہ اپنا پیٹ بھر سکے، اگر رزق حلال دستیاب نہ ہوا تو وہ حرام کی طرف جھکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ انسانی زندگی کی یہ مجبوری حساس انسانوں کو مضطرب کرتی ہے اور وہ اس کے ازالے کیلئے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ چشتی صاحب کی یہ کاوش بھی اسی اضطراب کی مظہر ہے جسے میں درست سمت میں محتاط قدم قرار دیتا ہوں۔ اللہ کرے دوسرے اہل علم و درد بھی اس

سمت کوئی قابل اعتماد پیش رفت کریں۔

شہباز چشتی صاحب نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ سب عصر حاضر کے سلگتے ہوئے موضوع ہیں، مثلاً

☆...... اعضاء کی پیوندکاری کی شرعی حیثیت۔ مدت سے زیر بحث مسئلہ جس نے طبی ماہرین اور فقہی بصیرت کے حاملین کے درمیان بڑی معاندانہ بحث کو تحریک دی ہے۔

☆...... پسند کی شادی کی شرعی حیثیت۔ یہ مسئلہ قانونی حلقوں میں نہایت اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ حال ہی میں شائستہ عالمانی کی شادی کا مسئلہ بہت بڑے اضطراب کا باعث بنا ہے۔

☆...... فون اور انٹرنیٹ پر نکاح کی شرعی حیثیت۔ سائنسی ارتقاء اور عصر موجود میں ایجادات کے پھیلاؤ نے بعض فوری نوعیت کے توجہ طلب مسائل کو جنم دیا ہے۔ یہ مسئلہ اسی قبیل کا ہے۔

☆...... انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت۔ مسئلہ کی سنگینی اصحابِ دانش کی توجہ چاہتی ہے۔

☆...... غیرت کے نام پر قتل کی شرعی و قانونی حیثیت۔ قبائلی ماحول اور جاگیردارانہ معاشرت کا اہم مسئلہ جو سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے۔

☆...... خاندانی منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت۔ آبادی کے پھیلاؤ اور وسائلِ رزق پر چند لوگوں کا قبضہ اس موضوع کا محرک بنا ہے۔

☆...... ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی حیثیت۔ پسند کی شادی کی شرعی حیثیت کے معاشرتی اثرات میں ولی کی اجازت کا مسئلہ بھی تضادِ خیال کا سبب بنا ہے۔

یہ وہ مسائل ہیں جو علماء کیلئے لمحۂ فکر ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مسائل پر متفقہ اور اجماعی فیصلہ حاصل کیا جائے تا کہ فکری تضاد معاشرتِ انسان کو دہلا کے نہ رکھ

دے۔ چشتی صاحب نے ان مسائل کو غور وفکر کا موضوع بنایا ہے تاکہ علماء و دانش وروں کو مزید توجہ کی دعوت دی جائے۔

ان مسائل کے علاوہ بعض قدیم موضوعات بھی مرکز توجہ بنے ہیں اور عصر حاضر کے تناظر میں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً

☆ ...... متعہ کی شرعی وقانونی حیثیت۔ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان یہ موضوع صدیوں سے معرض نزاع میں ہے۔ اہل سنت کے مؤقف کی تائید میں دلائل اکٹھے کیے گئے ہیں۔

☆ ...... سیرت طیبہ کی روشنی میں عورت کا مقام اور دائرہ کار۔ موضوع اپنی اساسی نوعیت کے حوالے سے قدیم ہے مگر مغربی تہذیبی یلغار کی وجہ سے اب زیادہ ہی توجہ چاہتا ہے، اسی لیے اس کو موضوع گفتگو بنایا گیا۔

☆ ...... پردہ کی شرعی حیثیت۔ عورت کے کردار اور سماجی مقام و مرتبہ کے حوالے سے یہ موضوع بھی عصر حاضر میں خصوصی نوعیت کا حامل ہے۔

☆ ...... دینی مدارس کا نظام اور نصابِ تعلیم۔ معاشی، معاشرتی اور علمی مسائل کی جدید نہج کا تقاضا ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ بھی عصر حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دیں اور چیلنج کی متنوع جہتوں کا سامنا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیں، اسی لیے چند مفید مشورے دیئے گئے۔

چشتی صاحب نے عدلیہ کے ایوانوں میں قومی احتیاج کے لازمی مسائل پر بعض فیصلوں کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے تاکہ ان کے مالہ وماعلیہ کو واضح کیا جاسکے۔

یہ مسائل کچھ یوں ہیں:

☆ ...... حدود آرڈیننس پر اعتراضات کا علمی جائزہ۔ حدود آرڈیننس جو جنرل ضیاء الحق کے عہد حکومت میں تیار ہوا تھا، تیاری کے اوّلین لمحہ سے ہی مختلف

افراد و اداروں کے درمیان باعث نزاع رہا۔ اس متنازع آرڈیننس کا چشتی صاحب نے بڑی عمدگی سے جائزہ لیا ہے۔

☆...... ربوٰ کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ۔ اس تجزیاتی موضوع کے حوالے سے وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلیٹ کورٹ میں وکلاء اور علماء کی طرف سے جو دلائل دیئے گئے، ان کا علمی اور قانونی محاسبہ کیا گیا۔

ان تمام دلائل، ابحاث اور تجزیات کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ شہباز چشتی صاحب نے اپنی دانست اور صلاحیت کو بڑی عمدگی سے استعمال کیا۔ ممکن بلکہ عین ممکن ہے کہ بعض آراء و نتائج سے اہل خرد و تحقیق ان سے اختلاف کریں۔ یہ علمی مباحث کا حق بھی ہے اور علمی پیش رفت کا تقاضا بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ چشتی صاحب نے اپنی آراء کو پیش ہی اس لیے کیا ہے کہ غور و فکر کے نئے راستے کھلیں اور اہل دانش ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل سے عہدہ برآ ہونے کیلئے علمی وقار عطا کریں۔ میں شہباز احمد چشتی کو اس علمی و تحقیقی کاوش پر مبارکباد دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے ملت کے ہر ہوش مند فرد کو دینی بصیرت سے آراستہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
صدر مرکز تحقیق، فیصل آباد

ابتدائیہ

اسلام کو درپیش چیلنجز کا حل

میری زیر نظر کتاب دراصل میرے ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو میں نے پچھلے پانچ سال میں ماہنامہ وائس آف ضیاء الاسلام و دیگر رسائل و جرائد کیلئے اس غرض سے لکھے تاکہ میں نسل نو کو یہ یقین دلاسکوں کہ اسلام کوئی جامد تصور حیات نہیں ہے اور نہ ہی اسلام کی تعلیمات محض مذہبی و روحانی واردات تک محدود ہیں بلکہ اسلام ایک متحرک نظریۂ حیات (Dynamic code of life) ہے جو ہر دور کے مسائل سے نبرد آزما ہونے اور ان کا قابل عمل حل پیش کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔

دورِ حاضر کے بے شمار جدید سلگتے ہوئے مسائل (Modern burning issues) یا جدید علمی انکشافات اور سائنسی تحقیقات جنہوں نے ہماری پڑھی لکھی نسل کو حیرت زدہ کر دیا ہے اور انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کیا واقعۃً اسلام ان جدید مسائل کے حوالے سے راہنمائی فراہم کرتا ہے یا نہیں؟

میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اس مضامین و مقالات میں یہ ثابت کروں کہ دین اسلام عصر جدید کے تمام مسائل کا قابل عمل، عقلی و منطقی حل پیش کرتا ہے اور مغرب و یورپ کی علمی و سائنسی ترقی جتنی منازل بھی طے کر لے تمام تر جدید سہولیات اور وسائل کے باوجود مغربی علم جس افق پر بھی نمودار ہوگا اسلام کی روشنی کو پہلے سے وہاں موجود پائے گا۔

اس کتاب کے ذریعے جہاں ہم دین کے حوالے سے عدم یقین کے شکار طبقہ کو باور کرا سکیں گے کہ اسلام دنیائے جدید کے تقاضوں کو جو انسانیت کی نفع بخشی

کیلئے مطلوب ہوں نہ صرف تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ ہمیشہ ان کا ساتھ دینے اور ان پر پورا اترنے کی ہمت رکھتا ہے۔

ہمارے وہ بیدار مغز سائنسدان جنہوں نے علم کو محض تھیوری کی بنیادوں سے نکال کر تجرباتی شکل بخشی وہ بالغ نظر حکماء جن کی نوکِ قلم نے ستاروں کے جگر چاک کر دیئے، وہ متبحر محققین جنہوں نے مبہم مسائل کی گتھیوں کو سلجھا کر دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، وہ عالی ہمت مصنّفین جنہوں نے دنیا کو جدید علم کی برکات بخشیں اور ماہرین فن ادباء، شعراء، فقہا اور علماء جن کے علمی کمالات کا مغرب بھی معترف ہے بلکہ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں بلکہ عین صداقت ہوگا کہ مغرب کا جدید علم وتمدن اور ہوشربا سائنسی ترقی دراصل مسلمان علماء وحکماء کی علمی کاوشوں کی مرہون منت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان صاحبان فکر ودانش کے علمی وسائنسی کارناموں کو آنے والی نسلوں کے سامنے اجاگر کیا جائے تاکہ وہ کسی احساس کمتری کا شکار ہونے کی بجائے اپنے علمی ورثہ پر بجا طور پر فخر کرنے کے قابل ہوسکیں۔

مسلمانوں کے علمی احسانات کا اعتراف خود مغربی مصنّفین نے بھی کیا ہے۔ جے ایم رابرٹس ایک منصف مزاج مؤرخ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں ہیں۔ ان میں سے ایک اس کی کتاب دنیا کی تاریخ جو 1050 صفحات پر مشتمل ہے جس کا نام ہے

J.M, The Pelican History of the World

اس کتاب میں مصنف نے کھلے طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عربی اسپین (Arab Spain) ہی یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا سبب تھا۔ حتیٰ کہ انڈیا، چین اور یونان کی علمی وراثت بھی اسپینی مسلمانوں ہی کے ذریعے یورپ تک پہنچی...... اس نے لکھا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرون وسطیٰ میں یورپ کسی بھی دوسری تہذیب کا اتنا

احسان مند نہیں جتنا اسلام کا ہے۔

To no other civilization did Europe owe so much in the middle ages as to Islam. (p.511)

اسلامی فلسفہٗ حیات کی تعمیر نو اور تشکیل جدید وہ کارنامہ ہے جو اس دور کے مسلم اسکالر کے اصل کرنے کا کام ہے کیونکہ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت دنیا بھر میں مسلمانوں کی نئی پود اپنے یقین کی از سر نو تجدید کا مطالعہ چاہتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کی بیداری کیلئے ضروری ہے کہ اس طریقہ فکر اور اسلوب حیات تک رسائی حاصل کی جائے جس کی بدولت یورپ مادی ترقی کی انتہاؤں تک جا پہنچا۔

مستشرقین نے ہمیں یہ احساس دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اسلام کی تہذیب قدیم مصری اور ہندی تہذیبوں کی طرح ایک مٹی ہوئی تہذیب ہے، جس طرح بابل ونینوا اب صفحہٗ ہستی پر صرف تاریخی طور پر زندہ ہیں، اسی طرح بغداد وقرطبہ کی تہذیبیں بھی اپنی اثر پذیری کھو چکی ہیں اور اسلام کی تہذیب ایک ختم شدہ قوت (Spent-up-force) ہے لہٰذا مسلمانوں کی بقا کا راز صرف اس میں رہ گیا ہے کہ وہ جدید مغربی علم وتہذیب کو اپنالیں۔ ہماری شکست خوردہ ذہنیت نے کافی حد تک اس اثر کو قبول کرلیا تھا مگر خدا اجر دے دانائے راز علامہ اقبالؒ کو جنہوں نے مسلمانوں کو پیغام دیا کہ غور کرو اگر اسلام کی تہذیب ایک ختم شدہ قوت ہے تو پھر عالمی سطح پر ہمارے خلاف اسقدر واویلا کیوں مچایا جارہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت اور حیات بخش تہذیب ہے۔

زیر نظر کتاب اسی احساس کے پیش نظر لکھی گئی ہے کہ اسلام کے حوالے سے ہم کسی معذرت خواہی کی بجائے اس کی حقانیت پر یقین محکم رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں اور اس کی ضیا بار کرنوں سے اقوام عالم کو بھی روشن کردیں۔

میں ممنون ہوں نامور ماہر تعلیم اور اسکالر پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی صاحب صدر مرکز تحقیق فیصل آباد کا جنہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کتاب کا پیش لفظ قلمبند کیا۔ آپ نے جہاں اس موضوع پہ اپنے وقیع خیالات و افکار کا اظہار فرمایا وہاں اس طفل مکتب کی حوصلہ افزائی فرما کر اسے مزید تحقیق کا شوق بخشا۔ ڈاکٹر صاحب کا اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر ان مقالات کا مطالعہ کرنے اور پیش لفظ لکھنے پر میں ان کا بہت زیادہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ کھڑی یونیورسٹی کے پرنسپل محترم جناب ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ان مقالات کا مطالعہ فرما کر اس ناچیز کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان کے علاوہ بھیرہ شریف کے شیخ الحدیث مفتی شیر خان صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کا اکثر حصہ پڑھا، بہت سے علمی نکات میں میری راہنمائی فرمائی اور ساتھ خوبصورت الفاظ کے ساتھ اس حقیر کوشش کو سراہا، میں آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ میں نوجوان عالم دین علامہ حافظ نوید اقبال صاحب جنڈ شریف کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری کے ہر مرحلے پر نہ صرف مفید مشاورت سے نوازا بلکہ کئی مواقع پر اس کی تکمیل و تسوید میں معاونت بھی فرمائی۔ ان کے علاوہ ملکوال سے محترم سیّد صفدر حسین گیلانی شاہ صاحب، حضرت علامہ مہر حیات حیدری صاحب اور جناب مولانا ارشد صابر صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری دینی و علمی کامیابیوں پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے میری ہمت بڑھائی۔

آخر میں بالخصوص جگر گوشۂ حضور ضیاء الامت حضرت صاحبزادہ حفیظ البرکات شاہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے از راہِ شفقت اس کتاب کی طباعت کا بیڑا اٹھایا اور مجھے مزید دینی کتب لکھنے کا حوصلہ بخشا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے اس کی بارگاہ بے کس پناہ

میں دست دعا اٹھاتا ہوں کہ وہ ذات اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقہ مجھے اپنی رضا، انسانیت کی نفع بخشی اور اسلام کی سربلندی کیلئے زبان وقلم کی صلاحیتوں کو صرف کرنے کی توفیق بخشے۔

آمین بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خاک پائے غلامانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شہباز احمد چشتی

ایم اے ایل ایل بی

فاضل بھیرہ شریف

10-05-08 (۱۴۲۹ھ)

ادارہ ضیاء الاسلام گجرات

حصہ اوّل

جدید قانونی مسائل اور ان کا شرعی حل

۱۔ ربوٰ کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ
۲۔ پسند کی شادی کی شرعی حیثیت
۳۔ فون اور انٹرنیٹ پر نکاح کی شرعی حیثیت
۴۔ غیرت کے نام پر قتل کا قانونی وفقہی تجزیہ
۵۔ یتیم پوتے کی وراثت کا اسلامی حل
۶۔ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی حیثیت
۷۔ حدود آرڈیننس پر اعتراضات کا علمی جائزہ

78117

ربو کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ

ایک اسلامی معاشرے میں سود قرآن وسنت اور اجماع امت کی رو سے حرام ہے۔ اس کی حلت کی کوئی شکل بھی اسلام میں جائز نہیں ہے مگر سیکولر، شکست خوردہ اور مغرب سے مرعوب ذہن ہمیشہ اس کے جواز کی راہیں تلاش کرتا رہا ہے۔ پاکستان جس کے قیام کا مقصد ہی ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا تھا جہاں اسلام کے اصولوں کا کامل اطلاق ونفاذ ہو سکے مگر بدقسمتی سے یہاں پر قائداعظم کے بعد کوئی بھی مخلص قیادت اِلا ماشاء اللہ میسر نہ آسکی جو اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے عملی جہد وجہد کرتی۔ یورپ کے دانشوروں کیلئے فکری غذا حاصل کرنے والوں نے یہی کچھ کرنا تھا جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ایک جھلک آپ کو درج ذیل کیس میں بھی مل سکتی ہے:

سپریم کورٹ کے فیصلے کا مختصر پس منظر

پاکستان کے تمام دساتیر میں یہ بات درج رہی ہے کہ حکومت پاکستان نظام معیشت سے سود کی لعنت ختم کرنے کیلئے بھرپور کوششیں کرے گی۔ یہ بات 1956ء کے آئین میں اور پھر 1962ء کے آئین میں بھی موجود تھی، پھر جب 1973ء کا آئین معرض وجود میں آیا تو اس آئین کے آرٹیکل 38 کی ذیلی دفعہ F میں اس مسئلہ کو ان الفاظ میں اجاگر کیا گیا:

The state shall eliminate Riba as early as possible.

1962ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا، جس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ علوم اسلامیہ کے ثقہ علماء اور اسکالرز پر مشتمل یہ کونسل پاکستان میں قوانین کی اسلامائزیشن کے ساتھ ساتھ عوام کی عمومی زندگی کو اسلامی سانچے میں

ڈھالنے کیلئے تجاویز مرتب کرے گی، نیز معاشی اور اقتصادی اداروں میں سود جیسی لعنت کے خاتمے کیلئے لائحہ عمل مرتب کرے گی، چنانچہ اس کونسل نے 1964ء سے لے کر 1967ء تک پاکستان میں رائج الوقت معیشت کا جائزہ لیا اور قرار دیا ہے کہ پاکستانی اقتصادیات سودی بنیادوں پر قائم ہے اور موجودہ بینکنگ سسٹم بھی چونکہ اسی معاشیات کا حصہ ہے اس لیے بینکوں کا لین دین بھی غیر اسلامی ہے۔

3 دسمبر 1969ء کو اسلامی نظریاتی کونسل نے ایک بار پھر اپنی رپورٹ میں تاکید کی کہ ربوٰ ہر صورت اور شکل میں حرام ہے اور شرح سود میں افراط وتفریط حرمت سود پر اثر انداز نہیں ہوتی، نیز بینکوں اور مالیاتی اداروں میں کاروباری لین دین میں اصل رقم پر جو بڑھوتری لی یا دی جاتی ہے وہ ربوٰ کی تعریف میں آتی ہے۔ سیونگ سرٹیفکیٹ پر جو سود دیا جاتا ہے وہ بھی ربوٰ میں شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبوں، مقامی اداروں اور سرکاری ملازمین کو دیئے گئے قرضوں پر ہر قسم کی بڑھوتری بھی سود ہی میں شامل ہے لہٰذا یہ تمام صورتیں حرام اور ممنوع ہیں۔

ستمبر 1977ء میں جنرل محمد ضیاء الحق نے کونسل کی مذکورہ بالا رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ کونسل ایسے طریقے بھی تجویز کرے جن کو اپنا کر سود جیسی لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے، جن پر 25 دسمبر 1950ء کو کونسل نے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کو اپنی رپورٹ پیش کی جس میں بینکوں کے ماہرین، اقتصادیات کے علماء اور دینی اسکالرز سے طویل مشورے کے بعد بلا سود معیشت سے متعلقہ تجاویز دی گئیں اور ساتھ یہ کہا گیا کہ ان تجاویز پر عمل درآمد سے دو سال کے اندر اندر پاکستان کی معیشت سود سے مکمل طور پر پاک ہو سکتی ہے، پھر 1990ء میں فیڈرل شریعت کورٹ میں درخواست دائر کی گئی کہ حکومت سود کے خاتمے کیلئے عملی اقدامات کرے۔ چنانچہ فاضل عدالت نے مقدمے کی سماعت کی اور نومبر 1991ء میں 157 صفحات پر مشتمل اپنا

تاریخی فیصلہ سنایا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں سود کی تعریف بھی متعین کی اور بینکوں سمیت تمام رائج الوقت سودی معاملات کے لین دین کو حرام قرار دیا اور حکومت اور تمام صوبوں سے کہا کہ وہ 30 جون 1992ء تک متعلقہ قوانین میں تبدیلی کریں۔ فاضل عدالت نے قرار دیا کہ یکم جولائی 1992ء سے تمام سودی کاروبار غیر اسلامی ہونے کے ناطے ممنوع قرار پائے گا۔ اس فیصلے کو عوامی دینی اور علمی حلقوں نے خوب سراہا مگر حکومت اور مالیاتی اداروں نے اس فیصلے کے خلاف خوب اودھم مچایا کہ اس سے کاروباری سرگرمیاں معطل ہو کر رہ جائیں گی، چنانچہ یکم جولائی 1992ء سے قبل حکومت اور اس کے گماشتوں نے فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلنٹ بنچ میں 118 کے لگ بھگ اپیلیں دائر کر دیں۔ شریعت اپیلٹ بنچ نے کئی ماہ اس مقدمے کی سماعت جاری رکھی اور یوں سود کا معاملہ عدالتی کاروائیوں کی نذر ہو گیا اور مقدمے کی سماعت کو اپنے انجام تک پہنچانے کیلئے اس دوران فاضل عدالت نے اسلامی قوانین کے ماہر، بینکوں اور مالیاتی اداروں کے سربراہوں، دینی اسکالرز اور محققین سے گہرا رابطہ رکھا اور بالآخر 1999ء کو شریعت اپیلٹ بنچ نے فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کو درست قرار دیتے ہوئے جدید بینکاری سمیت تمام سودی کاروبار کو اسلامی حوالے سے ناجائز، حرام اور ممنوع قرار دیا اور حکومت کو ہدایت جاری کی کہ وہ جون 2001ء تک تمام غیر اسلامی قوانین کو ختم کرے اور پاکستانی معاشرے کو سود جیسی لعنت سے نجات دلائے، چنانچہ جون 2001ء سے قبل حکومت نے دوبارہ ایک درخواست شریعت اپیلنٹ بنچ کے سامنے دائر کی اور سودی نظام کے خاتمے کیلئے دو سال کی مہلت طلب کی کہ بعض فنی مجبوریوں کے باعث خاتمہ سود ممکن نہیں، چنانچہ عدالت نے حکومت کی استدعا منظور کرتے ہوئے دو سال کی بجائے ایک سال کی مہلت دے دی کہ جون 2002ء تک تمام قوانین کو اسلامی سانچے

میں ڈھالنے اور سود کو ختم کرنے کیلئے اقدامات مکمل کیے جائیں۔

ایک ذاتی واقعہ

اس دوران دینی جماعتوں اور مذہبی طبقات نے اخباری بیانات اور جلسے جلوسوں کے ذریعے حکومتی نقطہ نظر کو خوب ہدف تنقید بنایا۔ اس دوران راقم الحروف کی ملاقات بھیرہ شریف میں جگر گوشۂ ضیاء الامت حضرت پیر محمد امین الحسنات شاہ صاحب سے ہوئی تو آپ فرمانے لگے کہ ہم حکومتی دباؤ پر ہونے والے عدالتی فیصلے کے خلاف احتجاجی مارچوں کے بجائے دنیا بھر سے مسلم اسکالرز، اسلامی قوانین کے ماہرین اور اقتصادیات کے علماء کو بلا کر اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں سیمینارز کروائیں گے تاکہ خاتمہ سود کی راہ میں حائل فنی مشکلات کا جائزہ لیکر ان کے ازالے کیلئے عملی اقدامات کیے جائیں اور حکومت کے سامنے اسلامی نظامِ معیشت کا قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے۔ آپ نے اس کی دو وجوہات بیان فرمائیں:

1- پاکستان میں سود کے خاتمے کیلئے تخریبی پہلو کے بجائے تعمیری اور اصلاحی انداز میں پیش رفت کی جائے۔

2- حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ کی روح مبارکہ کی تسکین ہو سکے کیونکہ آپ نے زندگی کے آخری ایام تک علالت کے باوجود عدالتی ذمہ داریاں سرانجام دیں تو صرف اس مقصد کے پیش نظر کہ میری زندگی میں سود کا کیس دوبارہ سپریم کورٹ میں آئے تو میں اپنے قلم سے سود کی حرمت کا فیصلہ لکھ سکوں۔

قبلہ پیر محمد امین الحسنات شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں راقم الحروف کو یہ ذمہ داری سونپی کہ میں اسلام آباد میں مختلف اداروں میں جا کر اس امر کا جائزہ لوں کہ وہ کونسی فنی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے حکومت نے Extention کی مدت کیلئے

درخواست دی ہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اسلام آباد میں کئی صاحبان علم سے اس سلسلہ میں Discuss کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ حکومتی اہلکاروں کی نیتوں میں فتور کے سوا کوئی بھی ایسی فنی مشکل نہیں جو سود کی حرمت کا فیصلہ کرنے سے مانع ہو۔ چنانچہ جون 2002ء بھی آ گیا۔

اب ایمانداری کا تقاضا تو یہی تھا کہ حکومت اپنی منہ مانگی مدت کے اندر خاتمہ سود کیلئے عملی پیش رفت کرتی لیکن اس مدت کے خاتمے سے قبل سابقہ حکومتی بنک یونائیٹڈ بنک آف پاکستان نے عدالت میں نظر ثانی کی درخواست دائر کر دی اور موقف اختیار کیا کہ وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلٹ بنچ کے فیصلوں میں بہت سے قانونی نقائص باقی رہ گئے تھے جنہیں دور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ نظر ثانی کی درخواست کی سماعت کیلئے جو بنچ تشکیل دیا گیا اس میں چیف جسٹس شیخ ریاض احمد، جسٹس منیر اے شیخ، جسٹس قاضی محمد فاروق، جسٹس ڈاکٹر خالد محمود اور جسٹس رشید احمد جالندھری شامل تھے۔ درخواست کی سماعت کے بعد UBL کے وکیل راجہ محمد اکرم اور حکومتی وکلاء رضا کاظم اور ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی نے سود کے حق میں دلائل دیئے جبکہ محمد اسماعیل قریشی نے حرمت سود کے بارے میں دلائل دیے۔

محمد اسماعیل قریشی کے دلائل اور سپریم کورٹ کا فیصلہ

حکومتی وکلاء کے دلائل ختم ہوئے تو دوسری طرف سے سود کے خلاف سینئر ایڈووکیٹ محمد اسماعیل قریشی نے اپنے دلائل کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے سب سے پہلے سپریم کورٹ کے بنچ کی تشکیل پر اعتراض کیا۔ محمد اسماعیل قریشی نے فنی قسم کے اعتراضات اٹھائے لیکن بہر صورت اس سلسلے میں ٹھوس دلائل کی ضرورت باقی رہی۔ ان کی معاونت چوہدری عبدالرحمن ایڈووکیٹ نے کی۔ ان کے علاوہ جماعت اسلامی کے وکیل جسٹس (ر) خضر حیات، جمعیت علمائے پاکستان کے صدر انجینئر سلیم اللہ نے

بھی دلائل دیئے۔ تاہم UBL کے وکیل اور حکومتی وکلاء کے اعتراضات اپنی جگہ ایک سوالیہ نشان کے طور پر باقی رہے۔ اس بحث کی تکمیل کے بعد سپریم کورٹ کے نظر ثانی بنچ نے 24 جون 2002ء کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے شریعت اپیلنٹ بنچ کے 23 دسمبر کے سنائے ہوئے فیصلے اور وفاقی شرعی عدالت کے 14 نومبر 1991ء کے دیئے ہوئے فیصلے کو منسوخ کر دیا اور سود کے مقدمے کو از سر نو سماعت کیلئے دوبارہ وفاقی شرعی عدالت میں بھیجنے کے احکامات جاری کیے تاکہ حکومتی وکلاء اور فریقین کے سوالات کی روشنی میں مذکورہ عدالت مقدمہ کا دوبارہ جائزہ لیکر اسے سپریم کورٹ کی طرف Refer کرے۔

راقم الحروف کا مؤقف

راقم الحروف کا مؤقف یہ ہے کہ سپریم کورٹ کا مذکورہ فیصلہ اعلیٰ عدالتی روایات کا امین نہیں ہے بلکہ اس میں حکومتی دباؤ کا عنصر شامل ہے۔ حکومتی وکلاء اور UBL کے وکیل کے دلائل بے بنیاد اور بھونڈے ہیں۔ پاکستان کی سرزمین ابھی ان صاحبان علم وفکر سے خالی نہیں ہوئی جو کہ مریض دلوں میں چھپے ہوئے وسوسوں کو نہ جان سکیں۔ مزید برآں یہ کہ عدالت عالیہ کو مفروضات پر مبنی دلائل پر فیصلہ دینے کی بجائے ثقہ علماء ذی احتشام ججوں اور اسلامی قوانین کے ماہرین سے رابطہ کرنا چاہئے تھا۔ وطن عزیز میں ابھی وہ زرخیز دماغ موجود ہیں جو دقیق اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کا ملکہ رکھتے ہیں۔

راقم الحروف کو صاحب علم ہونے کا زعم ہے اور نہ ہی قانون اسلامی کا ماہر ہونے کا دعویٰ البتہ قانون اور دین اسلام کا ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے حکومتی وکلاء کے دلائل کا ردّ اور محاکمہ اور ان دلائل کے ٹھوس جوابات دینا اپنی دینی وملی فریضہ سمجھتا ہے۔

سابقہ حکومتی بینک UBL کے وکیل اور حکومتی وکلاء کے دلائل علیحدہ علیحدہ ذکر کرنے کی بجائے میں اپنے جوابات میں ان کی ہر دلیل کو لکھ کر اس کا ردّ لکھ رہا ہوں۔

ایک بات واضح رہے کہ سپریم کورٹ نے اپنے مذکورہ فیصلے میں فریقین کے دلائل سننے کے بعد چند نئے سوالات بھی اٹھا دیئے۔ حالانکہ سپریم کورٹ میں نظر ثانی (Review) کی درخواست دائر کی گئی تھی نہ کہ اپیل (Appeal) کی اور اصولی طور پر Appeal میں تو نئے سوالات اُٹھائے جاسکتے ہیں لیکن Review میں نئے سوالات اُٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی جبکہ سپریم کورٹ نے نہ صرف نئے سوالات اُٹھائے بلکہ فیڈرل شریعت کورٹ اور شریعت اپیلنٹ بنچ کے فیصلوں کو بھی رد کر دیا جو خود انصاف کے تقاضوں کا خون کرنے کے مترادف ہے۔ آیئے حکومتی وکلاء کے دلائل کا علمی جائزہ لے کر ان کے کھوکھلے پن کو ظاہر کریں نیز ان دلائل کے ٹھوس جوابات بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حکومتی وکلاء کے ردّ میں راقم الحروف کے دلائل

1- UBL کے وکیل نے کہا کہ "قرآن مجید میں اضعاف مضعفہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں یعنی دوگنا، چوگنا سود منع ہے لہٰذا سود کی وہ رقم جو دوگنا، چوگنا رفتار سے نہیں بڑھتی وہ اسلام میں جائز ہے"۔ ان کی دلیل کہ "قرآن کریم نے سود کی اس شکل کو منع کیا ہے جو اضعاف مضعفہ یعنی سود در سود ہو جبکہ تھوڑے سے سود کی حرمت واقع نہیں ہوتی" بالکل ایک بے بنیاد بات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ اضعاف مضعفہ قید واقع ہے نہ کہ قید احترازی چونکہ جب سود سے منع کیا گیا اس وقت سود کی اضعاف مضعفہ والی صورت رائج اور وقوع پذیر تھی۔ لہٰذا یہ قید شامل کر لی وگرنہ سود ہر صورت میں حرام ہے۔ چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، اس کی تائید فرمان رسول ﷺ سے بھی ہوتی ہے۔ موطا شریف میں ہے

لایجوز منه قلیل و کثیر [1]

ترجمہ: یعنی سود کسی صورت میں بھی جائز نہیں تھوڑا ہو یا زیادہ۔

2- انہوں نے کہا کہ "قرض کی وہ رقم جو کاروبار میں لگائی گئی ہو اس پر منافع لینا بھی بیع کے زمرے میں آتا ہے" حالانکہ نفع کی شرط سے قرض لینا اور دینا حرام اور ناجائز ہے اور وہ بھی سود ہی کے زمرے میں آتا ہے۔

بیہقی میں حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے اور یہی روایت جامع صغیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربوٰ [2]

"جس قرض میں قرض دہندہ کیلئے نفع کی شرط ہو وہ سود ہی کی ایک قسم ہے"

3- بیع، سود کی طرح نہیں، بیع سود سے مختلف بلکہ اس کی ضد ہے۔ مثلاً بیع میں بائع اور مشتری کے درمیان درج ذیل تین اصول کارفرما ہوتے ہیں۔

i- دونوں طرف سے رضا و رغبت

ii- باہمی تعاون و اشتراک

iii- دونوں کیلئے منفعت کا اصول۔

اور یہ تینوں اصول دین و قانون اور اخلاق کی نظر میں درست ہیں جبکہ سود میں ان کے برعکس تین اصول کارفرما ہوتے ہیں۔

i- ایک طرف سے رضا و رغبت اور دوسری طرف سے مجبوری

ii- ایک کا یقینی نقصان اور دوسرے کا یقینی نفع

iii- باہمی تعاون اشتراک اور انسانی ہمدردی کا فقدان

4- UBL کے وکیل کا یہ کہنا ہے کہ "فکسڈ ڈیپازٹ (Fixed Deposit) پر نفع حاصل کرنا بھی بیع ہی کی تعریف میں آئے گا کیونکہ فکسڈ ڈیپازٹ کی رقم بھی کاروبار میں لگائی جاتی ہے۔" یہ بھی بالکل ایک لغو بات ہے۔ فکسڈ ڈیپازٹ پر نفع حاصل کرنا ہی تو سود ہے جس کو وہ بیع کہہ رہے ہیں اور سود

اور بیع میں فرق نہ کرنے والوں کیلئے قرآن مجید کی سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ [3]

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن اپنی قبروں سے) اس طرح اٹھیں گے جیسے کسی کو شیطان نے چھوکر اسے مخبوط (حواس باختہ) بنادیا ہو یعنی قیامت کے دن سود خور فالج زدہ شخص کی طرح اٹھے گا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا [4]

ترجمہ: یہ حالت اس لیے ہوگی کہ انہوں نے کہا کہ بیع (خرید وفروخت) سود کی طرح ہے۔

دولت کی چمک نے ان کے ذہنوں کو اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ ایک طرف فکسڈ ڈیپازٹ پر ملنے والے نفع کو بیع (شراکت) پر ملنے والے نفع سے مشابہ قرار دیکر علمی بددیانتی کے مرتکب ہورہے ہیں تو دوسری طرف اس کو اسلام کے اصولِ تجارت کے عین مطابق قرار دیکر اسلامی شریعت پر بہتان باندھنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔

-5 UBL کے وکیل کا یہ کہنا کہ ''سود سے متعلق اسلامی ہدایات قانونی درجہ نہیں بلکہ اخلاقی درجہ رکھتی ہیں'' یہ قرآنی آیات، احادیث نبوی اور اسلامی قوانین سے نابلد ہونے کے مترادف ہے۔ ذرا تصور کریں جو چیز قانون کی بجائے اخلاقی درجے پر ہے بھلا اس کے ترک کرنے پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ کی دھمکی کیسے دی جاسکتی تھی جبکہ قرآن

مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اے ایمان والو! سود چھوڑ دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر

فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۝

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو''

کیا صرف اخلاقی پہلو کو نظر انداز کرنے سے اتنی بڑی وعید سنائی جا سکتی تھی؟

6- حکومتی وکیل رضا کاظم نے کہا کہ '' آئین کے آرٹیکل 38 کے تحت مشروط طور پر ربوٰ کی اجازت دی گئی ہے'' اندازہ فرمائیں کہ حکومتی وکیل آئین پاکستان کے متن کی تشریح (Interpretation of Statutes) کس طرح بھونڈے انداز میں کر رہا ہے۔ آئین کے آرٹیکل 38 کی کلاز F میں درج ذیل الفاظ مرقوم ہیں۔

The state shall eliminate riba as early as possible

ترجمہ: '' حکومت جتنا جلدی ممکن ہو سکا ربوٰ کو ختم کرے گی۔''

اب آئین کے الفاظ (as early as possible) سے موصوف سود کی مشروط اجازت مراد لے رہے ہیں۔ یہ کس قدر کور ذہنی کی علامت ہے حالانکہ آئین تو ریاست کو جلد از جلد خاتمہ سود کیلئے پابند کر رہا ہے۔ واضح رہے کہ Shall کا لفظ وجوب (Mandatry) کا درجہ رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا الفاظ 1973ء کے آئین میں درج کیے گئے تھے اور اب 2002ء ہے۔ یعنی 29 سالوں میں ہماری حکومتیں اور ان کے گماشتے سود کی لعنت سے چھٹکارے کیلئے تو کوشش نہ کر سکے البتہ سود کے جواز کیلئے انہوں نے آئین پاکستان کے چہرے کو مسخ کیا اور حقیقت کو بناوٹی الفاظ سے چھپانے کی سر توڑ کوشش بھی کرتے رہے۔

7- حکومتی وکیل نے کہا ''وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے سے سنگین نتائج برآمد ہونے کا خدشہ ہے۔ اگر رائج الوقت سودی نظام بند کر دیا گیا تو ملک کا معاشی ڈھانچہ منہدم ہو جائے گا جس کا لازمی نتیجہ پاکستان کی تباہی ہوگا۔'' اسلام کے نام پر حاصل کردہ ملک کی عدالت عالیہ میں کھڑے ہو کر یہ دلائل دیئے جا رہے ہیں کہ اگر سودی نظام ختم کر دیا گیا تو پھر ملک کا معاشی ڈھانچہ منہدم ہو جائے گا حالانکہ ملک کا معاشی ڈھانچہ تباہی کے دہانے پر پہنچا ہی اس سودی نظام کی وجہ سے ہے۔ پاکستان میں سودی نظام نے نہ صرف عوام کو بلکہ حکومتوں کو غیر ملکی قرضوں کی زنجیروں میں اس قدر مضبوطی کے ساتھ جکڑ رکھا ہے کہ ہر حکمران کشکول گدائی لیکر کبھی آئی ایم ایف تو کبھی ورلڈ بنک کی دریوزہ گری کرتا ہے اور علامہ اقبال کے بقول

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نا امیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

حکومتی وکیل کی دلیل کا کھوکھلا پن درج ذیل اعداد و شمار سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ ذرا سودی نظام کی تباہ کاریاں تو ملاحظہ فرمائیں۔ 80-1979ء میں حکومت پاکستان نے ملکی اور غیر ملکی قرضہ جات پر 5 ارب 70 کروڑ روپے سود ادا کیا۔ پھر 88-1987ء میں صرف سود کی مد میں 29 ارب 34 کروڑ 30 لاکھ روپے ادا کیے گئے اور 91-1990ء میں یہ رقم 47 ارب 34 کروڑ 30 لاکھ تک جا پہنچی۔ کیا یہ معاشی ڈھانچے کا تحفظ ہے یا ملکی معاشی ڈھانچے کو سود کے بم سے اڑانے کی مذموم اور ناپاک کوشش ہے۔ اور دوسری طرف ان کا یہ کہنا ہے کہ سودی نظام کے خاتمے میں پاکستان کی ہلاکت ہوگی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادِ گرامی کی تکذیب کے مترادف ہے۔ صحیح بخاری

شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا **اجتنبوا السبع الموبقات** (سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو) پھر آپ نے تفصیل بتائے ہوئے ان میں سے ایک چیز **اکل الربوٰ** (سود کا کھانا) ارشاد فرمایا۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سود خوری کو ہلاکت کا ذریعہ بتا رہے ہیں اور ہمارے وکلاء سودی نظام کے خاتمے کی صورت میں ہلاکت کی وعیدیں سنا رہے ہیں۔ یاللعجب۔

8- حکومتی وکیل نے کہا کہ ”بنکوں میں جمع رقوم کا ساٹھ فیصد غریب عوام کی جمع پونجی پر مشتمل ہے جو ان رقوم سے حاصل ہونے والے منافع سے اپنی ماہانہ گزر اوقات کرتے ہیں۔ سودی سسٹم کی تبدیلی سے غریب کی رقم ڈوبنے کا خدشہ ہوگا۔ نیز قومی معیشت میں زر کی آمد رکنے سے ملک عظیم مالی بحران سے دوچار ہوسکتا ہے۔“

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ موجودہ سودی نظام سے غریب کو ریلیف دینے کی بجائے استحصال کرتے ہیں۔ بنکوں اور مالیاتی اداروں کے ذریعے متوسط طبقے کا استحصال کیا جاتا ہے جس کی ایک شکل یہ ہے کہ ایک سروے کے مطابق بنکوں کے فکسڈ ڈیپازٹ اکاؤنٹس میں 70 سے 80 فیصد رقم 15 سے 25 ہزار روپے تک جمع کرانے والے غریبوں اور چھوٹے کھاتہ داروں کی ہوتی ہے مگر جب انہی ڈیپازٹس سے قرضہ جات (Loans) جاری کرنے کا وقت آتا ہے تو صرف 5 یا 6 فیصد قرضہ جات متوسط طبقے کو ملتے ہیں اور وہ بھی کسی وڈیرے کی سفارش پر۔ جبکہ 94 فیصد قرضہ جات بڑے بڑے صنعت کار، زمیندار اور سیاسی جگادری ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ قرضے بنکوں کو واپس نہیں کرتے بلکہ سیاسی اثر و رسوخ کے ذریعے معاف

کرانے کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ اس طرح بنکوں میں جمع شدہ غریبوں کے خون پسینے کی رقم پر مدتوں تک یہ ساہوکار نہ صرف خود پلتے ہیں بلکہ ان کی نسلیں بھی اسی رقم سے سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ میں جائیدادیں بناتی ہیں۔

اسی طرح P.L.S اکاؤنٹس میں بھی زیادہ تر رقم چونکہ متوسط طبقے کی ہی ہوتی ہے لہٰذا اس پر ملنے والے منافع کی شرح افراط زر کی شرح سے بہت کم ہوتی ہے۔ نتیجتاً چند صنعت کار اور سرمایہ دار غریبوں کی جمع شدہ رقم سے کروڑوں، اربوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ اب انصاف کی قسم اٹھا کر بتایئے کہ موجودہ سودی نظام کے خاتمے سے غریبوں کے چولہے ٹھنڈے پڑیں گے یا بڑے بڑے سودخوروں کی ملوں اور فیکٹریوں میں چلنے والی مشینری زر کی قلت سے منجمد ہو جائے گی؟ اگر آپ نے عدل کا دامن نہیں چھوڑا تو جواب یہی ہوگا کہ سودی نظام کے خاتمے سے غریب کو تو فرق نہیں پڑے گا البتہ امیر زادوں کے رخساروں سے غریبوں کے خون پسینے کی کمائی ہوئی دولت کی سرخی چھن جائے گی۔

-9 حکومتی وکیل نے مزید کہا کہ ''حکومت نے غیر سودی نظام نافذ کرنے کے سلسلے میں رہنمائی کیلئے 53 اسلامی ممالک سے رابطہ کیا۔ ایران اور سوڈان کے بینکنگ سسٹم کا جائزہ لیا لیکن تمام ممالک نے بلاتخصیص یہی مشورہ دیا کہ سود سے پاک بینکنگ نظام کا قیام ناقابل عمل ہے۔'' یہ دلیل بھی حقائق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ صرف ایران کے شہر تہران میں پانچ ایسے بنک ہیں جو بلاسود بینکاری کر رہے ہیں۔ مثلاً

-i تجارت بنک تہران — Bank Tejarat Tehran

-ii میلی بنک ایران تہران — Bank Melli Iran, Tehran

iii- ملت بنک تہران Bank Millat, Tehran

iv- سیپاہ بنک تہران Bank Sepah, Tehran

اسی طرح صرف سوڈان کے شہر خرطوم میں آٹھ مالیاتی ادارے ایسے ہیں جو غیر سودی نظام پر چل رہے ہیں۔ مثلاً

i- فنانشیل اسلامک بنک آف سوڈان

ii- اسلامک انشورنس کمپنی آف سوڈان

iii- البرکہ بنک خرطوم

iv- البرکہ انشورنس کمپنی

v- تغمم اسلامک بنک خرطوم

vi- سوڈانیز اسلامی بنک خرطوم

vii- اسلامک کواپریٹو بنک

viii- اور اسلامک بنک فار ویسٹرن سوڈان

ان کے علاوہ مسلم دنیا میں کئی ایسے ملک ہیں جن میں بلاسود بینکاری کے عملی تجربات نہایت کامیاب جارہے ہیں جن میں سعودی عرب، بحرین، بنگلہ دیش، مصر، کویت اور قطر وغیرہ شامل ہیں۔

لہٰذا یہ کہنا کہ بلاسود معیشت ممکن ہی نہیں عصرِ حاضر کے چیلنجز کا جواب دینے کی بجائے ان کے سامنے ہتھیار پھینکنے (Surunder) کے مترادف ہے۔

ایک بار نیت کا فتور ختم ہو جائے تو پھر اس دنیا میں کون سی چیز ناممکن ہے؟

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

10- دوسرے حکومتی وکیل ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ

''ربوٰ کی مکروہ اقسام کو حکومتی اداروں کے ذریعے نافذ العمل کرنا سنت رسول ﷺ کے خلاف ہے۔ نیز مکروہ اور حرام ربوٰ کو سود کی تعریف میں شامل کر لیا گیا ہے جو عدالت کے اختیار میں نہیں۔''

ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ شریعت اسلامی میں ربوٰ کی کوئی مکروہ قسم نہیں ہے۔ ربوٰ کی دو ہی قسمیں ہیں ایک ربوٰ الفضل جبکہ دوسری ربوٰ النسیۂ ہے۔ ربوٰ الفضل سے مراد ایک چیز زائد جبکہ دوسری کم دینا اور ربوٰ النسیۂ (Deffer Payment) ایک چیز اس وقت اور دوسری بعد میں دینے کا وعدہ کرنا ہے۔ اور رقم کی ادائیگی بھی بعد میں کرنا ہے۔ یہ دونوں اقسام بالاتفاق حرام ہیں۔

باقی رہا مکروہ کا مسئلہ تو اس کی بنیادی طور پر تین اقسام ہیں۔

1) اولاً وہ چیزیں جن کو قرآن مجید میں مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

2) ثانیاً وہ چیزیں جنہیں احادیث مبارکہ میں مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ مکروہ کی مندرجہ بالا دونوں اقسام بھی بالاتفاق حرام ہیں اور ان کو مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔

3) ثالثاً وہ چیزیں جن کو نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔ اس قسم کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے بارے میں تھوڑی سی رعایت دی گئی ہے لیکن ایک امتی کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس قسم کو بھی نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔

حکومتی وکیل نے امام ابوحنیفہ کی جس روایت کی بنیاد پر سود کو مکروہ قرار دیا ہے اس روایت کو مکمل پڑھا ہی نہیں گیا۔ امام ابوحنیفہ نے دوٹوک انداز میں وضاحت فرمائی ہے کہ مکروہ سے ان کی مراد حرام ہی ہے۔

باقی ڈاکٹر گیلانی کا یہ کہنا کہ ''مکروہ اور حرام ربوٰ کو سود میں شامل کرنا عدالت کے دائرہ اختیار میں ہی نہیں ہے'' عدالت کے دائرہ اختیار کو محدود کرنے

کے مترادف ہے۔ حالانکہ عدالت کا بنیادی مقصد ہی متن کی شرح (Interpretation of statutes) میں شارع کی اصل منشا تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔

To discover the true intention of lawgiver

اس امر سے ہر صاحب علم واقف ہے کہ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ انتظامی اور عسکری عہدوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عدالتی مناصب پر بھی فائز رہے۔ عہد صدیقی میں آپ مدینہ منورہ میں قاضی القضاۃ (Chief Justice) تھے۔ آپ کا ایک قول مبارک ہے فذرو الربوٰ والریبہ پس تم سود کو چھوڑ دو اور اس چیز کو بھی جس میں سود کا شک ہو۔

ڈاکٹر محمد رواس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے اپنی کتاب موسوعہ فقہ میں لکھا ہے کہ لفظ ''ریبہ'' جو حضرت عمرؓ نے ''ربوٰ'' کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے ''ریب'' سے مشتق ہے۔ اس کے معنی شک وشبہ کے ہیں اور یہاں اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اس کی علت کی بابت ذہن میں شک وشبہ پیدا کرے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ ربوٰ کے بارے میں بڑے محتاط تھے اور آپ اکثر فرماتے تھے ''ہم نے ربوٰ کے خوف سے نو، دس حلال چیزوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول مبارک سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک تو آپ ربوٰ کی ہر صورت کو حرام سمجھتے ہیں اور دوسرا یہ کہ عدالت کسی شرعی حکم کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے صوابدیدی (Discretionry) اختیارات استعمال کرسکتی ہے۔

-11 حکومتی وکیل ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی نے کہا ہے کہ ''شریعت اپیلنٹ بنچ

اس امر کا ادراک کرنے سے قاصر رہا ہے کہ وہ جو متبادل اقتصادی نظام تجویز کر رہا ہے اس پر اتفاق رائے نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کے سختی کے ساتھ مخالف ہیں۔''

ان کی اس دلیل سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومتی وکلاء یا حکومت کے تنخواہ یافتہ دانشوروں کے تجویز کردہ معاشی نظام پر پوری امت کا اتفاق ہے؟ اور اگر اس مسئلہ پر دو صحابہ کی اختلاف رائے موجود بھی ہو تو اس کی بنیاد پر صحابہ کی اکثریت کی رائے کو رد کیسے کیا جا سکتا ہے؟ حالانکہ صحابہ میں سے حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت براء بن عازب، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت عبداللہ بن حنظلہ اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم نہ صرف حرمت سود کے سختی سے قائل تھے بلکہ حرمت سود کی وہ احادیث بھی انہی سے مروی ہیں جن میں سود خور کے کم سے کم گناہ کو اپنی ماں سے زنا کرنے والے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

-12 ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی نے کہا کہ ''امام فخر الدین رازی کی مشہور تفسیر الکبیر میں درج ہے کہ ربوٰ کا معنی بڑھوتری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر طرح کی بڑھوتری کی وصولی ربوٰ کے زمرے میں آتی ہے، یعنی غیر قانونی ہے۔''

ان کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کی مندرجہ بالا عبارت کو سیاق و سباق سے ہٹ کر پڑھا اور پیش کیا ہے اور جہاں تک عبارت کے مذکورہ بالا حصے کا تعلق ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ امام رازیؒ ربوٰ کی کسی قسم کو جائز سمجھتے تھے یہ تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ربوٰ کا معنیٰ بڑھوتری ہے اور ہر طرح کی بڑھوتری غیر قانونی بھی نہیں ہے بلکہ صرف وہی بڑھوتری غیر شرعی ہے جو عقد میں ایک طرف مشروط کر

لی گئی ہو خواہ کاروبار اس نفع ہو یا نقصان۔ باقی رہا مسئلہ بڑھوتری کا تو اسی سپریم کورٹ میں جسٹس (ر) خضر حیات نے کہا کہ (نامور سکالر) ڈاکٹر یوسف قرضاوی اس بات کو رد کرتے ہیں کہ کرنسی نوٹ کی ویلیو کم ہو جانے سے بڑھوتری وصول کی جاسکتی ہے۔

13- حکومتی وکیل کا یہ کہنا کہ "ممانعت سود کے اصول کو اگر مان بھی لیا جائے تو صرف پرسنل لاء کی حد تک تسلیم کیا جاسکتا ہے اور سود کی ممانعت کے اسلامی قانون کو غیر مسلموں پر لاگو کرنا بذات خود قرآن و سنت کے خلاف ہے۔"

ان کی اس بودی دلیل کا جواب یہ ہے کہ سود کا مسئلہ کسی صورت میں بھی پرسنل لاء نہیں بلکہ یہ ایک پبلک مسئلہ ہے اور یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ صرف پرسنل لاء ہوتا تو اسے دستور پاکستان کے آرٹیکل 38 میں پرنسپل آف پالیسی کے تحت شامل نہ کیا جاتا اور حرمت سود کا قانون غیر مسلموں پر منطبق کرنے سے قرآن و سنت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی بلکہ جس طرح قرآن و سنت میں سود حرام ہے اسی طرح بائبل اور انجیل میں بلکہ تمام الہامی کتب میں سود کی حرمت کا حکم فرمایا گیا۔ اس لحاظ سے سود صرف پرائیویٹ اور پرسنل مسئلہ نہیں بلکہ سرکاری اور پبلک مسئلہ ہے۔ بلکہ میرے نزدیک یہ ساری انسانیت کا مسئلہ ہے اگر عالمی سطح پر سود کی حرمت کا قانون انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے ذریعے پاس کر دیا جائے اور اس پر عملدرآمد بھی ہو جائے تو دنیا کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے عالمی سود خور اور خونخوار مافیا کی چیرہ دستیوں سے نجات مل سکتی ہے۔

مصادر و مراجع

۱۔ موطا امام مالک ج ۲ صفحہ ۵۷۱

۲۔ بیہقی عن فضالہؓ ج ۵ صفحہ ۳۵

جامع صغیر عن علیؓ ج ۲ صفحہ ۹۳

۳۔ البقرہ ۲:۲۷۵

۴۔ البقرہ ۲:۲۷۵

۵۔ البقرہ ۲:۲۷۹

شائستہ عالمانی کیس

پسند کی شادی کی شرعی حیثیت

اس بات کو نصف سال سے زیادہ عرصہ ہونے کو ہے کہ جون 2003ء کو عالمانی قبیلے کی ایک بالغ لڑکی نے مہر قبیلے کے ایک بالغ لڑکے بلخ شیر سے شادی کر لی۔ بعد ازاں صدیوں پرانی روایات میں جکڑے ہوئے یہ قبائل اچانک بھڑک اٹھے اور انہوں نے شادی کے اس بندھن پر ''کاروکاری'' کی کالک ملنے کی کوشش کی۔ نوجوان جوڑا قبائلی سرداروں کی آتش انتقام سے بچنے کیلئے اسلام آباد بھاگ گیا لیکن فرسودہ رسومات نے وہاں بھی پیچھا کیا تو ان کیلئے ان سے جان چھڑانا ممکن نہ رہا اور وہ کراچی چلے گئے جہاں فیملی جج نے ان کی شادی کو ''کورٹ میرج'' قرار دے دیا۔ ادھر عالمانی اور مہر قبیلے کے سرداروں نے ایک دوسرے کے خلاف محاذ جنگ سجا لیا۔ بالآخر بلخ شیر کو خاندانی رسوم ورواج کے سامنے ماتھا ٹیکنا پڑا اور اس نے 24 اکتوبر 2003ء کو شائستہ کو طلاق دے دی۔ قبائلی تعلقات سے کٹی ہوئی شائستہ عالمانی نکاح کے بندھن سے بھی محروم ہوگئی۔ قبیلے کے سرداروں نے شائستہ کو سزائے موت دینے کا اعلان کیا جس کی بعد ازاں اگرچہ اخبارات میں تردید بھی آئی لیکن شائستہ بدستور خوف ووحشت کے سائے میں کپکپا رہی تھی کہ اچانک میڈیا کا فلیش پوائنٹ بن گئی۔ یوں بیلے اور کائیوں میں جنم لینے والی داستانِ محبت عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس طرح شائستہ عالمانی کیس صاحبانِ فکر ونظر کی بحث کا موضوع بن گیا۔

شائستہ کے مستقبل کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا مجھے سردست دین اور قانون کا ادنیٰ سا طالبعلم ہونے کے ناطے اپنے قارئین کی خدمت میں اس کیس کا

شرعی وقانونی پہلو عرض کرنا ہے۔

اسلام میں پسند کی شادی

ہمارے ہاں پسند کی شادی کیلئے ''لومیرج'' کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ Love Marriage اور Like Marriage میں بڑا فرق ہے۔ اسلام شادی سے قبل کسی بھی خفیہ تعلق یا "Love Fair" کو نہ صرف جائز نہیں سمجھتا بلکہ اس کی مذمت بھی کرتا ہے۔ ہاں البتہ شادی کے سلسلہ میں بالغ لڑکی اور لڑکے کی پسند و ناپسند کو صرف جائز ہی نہیں مستحسن بھی سمجھتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام میں نکاح سے قبل منگنی ''خطبہ'' کا تصور بھی موجود ہے۔ یہ نکاح سے قبل ایک دیباچہ ہے تاکہ مرد وعورت اور ان کے خاندان ایک دوسرے کیلئے اجنبی نہ رہیں بلکہ حدیث پاک میں تو نکاح سے قبل مرد وعورت کا ایک دوسرے کو دیکھ لینے کا باقاعدہ حکم موجود ہے۔ اس لحاظ سے اسلام پسند کی شادی جس کو میں ''Love Marriage'' کی بجائے ''Like Marriage'' کا نام دوں گا، کی اجازت دیتا ہے۔ جیسا کہ مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اسے دیکھ لو ایسی صورت میں تمہارے درمیان موافقت پیدا ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔'' مغیرہ عورت کے والدین کے پاس آئے اور انہیں مطلع کیا انہوں نے نامناسب خیال کیا لیکن جب عورت نے پردہ کے اندر سے سنا تو کہنے لگی اگر رسول پاک ﷺ نے دیکھنے کیلئے فرمایا ہے تو دیکھ لیجئے۔ مغیرہ کہتے ہیں یہ جواب سن کر میں نے اسے دیکھ لیا اور اس سے شادی کر لی۔

نکاح سے قبل عورت کو دیکھنے کے متعلق علامہ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ مخطوبہ (وہ عورت جس سے منگنی کی جارہی ہو) کو کس حد تک دیکھا جا سکتا ہے؟ اس کی کوئی صراحت نبی پاک ﷺ نے نہیں فرمائی۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ چہرے

اور ہتھیلیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں پیغام کی کیا خصوصیت ہوئی کیونکہ ان پر تو پیغام کے بغیر بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ پیغام کیلئے دیکھنے کا جو استثنٰی ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عام حالات میں جس حد تک دیکھنا جائز ہے اس موقع پر کچھ زیادہ ہی دیکھنا جائز ہوگا۔ ایک طرف بعض علماء اس حد تک رخصت کے قائل ہیں اور دوسری طرف بعض علماء اس بارے میں بڑی سخت رائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض محققین متوسط رائے یہ رکھتے ہیں کہ پیغام دینے والے شخص کو اس حد تک اجازت ہونی چاہیے کہ وہ مخطوبہ کو ایسے لباس میں دیکھے جس میں وہ اپنے باپ، بھائی اور دیگر محرم رشتہ داروں کے سامنے بلا تکلف آتی ہے بلکہ اس بات کی بھی اجازت ہونی چاہیے کہ مخطوبہ کے فہم، ذوق اور امتیازی خصوصیات کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے کسی محرم کی معیت میں اس کے ساتھ کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں معمولاً اس مخطوبہ کی آمد و رفت رہتی ہو بشرطیکہ وہ مقام جائز نوعیت کا ہو اور مخطوبہ شرعی لباس میں ہو۔ لہٰذا کسی مسلمان باپ کیلئے جائز نہیں کہ وہ رسم و رواج کے نام پر اپنی بیٹی کو نکاح کی غرض سے دیکھنے سے روکے، ضروری ہے کہ رسم و رواج، شریعت کے تابع رہیں نہ کہ شریعت رسم و رواج کے تابع ہو جائے اور یہ بھی جائز نہیں کہ کوئی اس رخصت سے فائدہ اٹھا کر پیغام دینے کے نام پر تھیٹروں، تفریح گاہوں اور بازاروں کی سیر کرے یا بغیر محرم کے عورت کو ساتھ لے جائے یعنی رخصت سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے اور سختی سے بھی بچا جائے اور درمیانہ راستہ اختیار کیا جائے کیونکہ اسلام دین اعتدال ہے۔ (اسلام میں حلال وحرام)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پسند و ناپسند میں والدین یا بھائی یعنی ولی کی حیثیت کیا ہے یا وہ کس حد تک مداخلت کر سکتے ہیں۔

نکاح میں ولی کی حیثیت

آئمہ اربعہ اور شیعہ مکتبہ فکر کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نابالغ کا نکاح اس کا ولی کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح نابالغی کی عمر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم ﷺ سے کیا تھا۔ جہاں تک نابالغ بچے یا بچی کا تعلق ہے تو انہیں تو بلوغت کے بعد پسند و ناپسند کی بنیاد پر خیارِ بلوغ (Option of Puberty) بھی استعمال کرنے کا حق دیا گیا ہے جیسا کہ صاحبین کے نزدیک اگر ولی نے نکاح غیر کفو یا مہر مثل سے کم پر کیا ہو تو نابالغ لڑکی خیارِ بلوغ استعمال کر سکتی ہے۔ اگرچہ پاکستانی قانون کے مطابق نابالغ کا نکاح قابل سزا جرم ہے لیکن شریعت اسلامی کی روح اور مصالح کے خلاف ہے۔ تاہم اس وقت ہمارا موضوعِ سخن یہ ہے کہ نابالغ کا نکاح ولی کے ذریعے کرنے پر کسی کو اختلاف نہیں لیکن کیا بالغ مرد و عورت کے نکاح کیلئے بھی ولی کی اجازت و منشا ضروری ہے یا نہیں، کیونکہ حال ہی میں فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان نے بالغ اور بالغہ کیلئے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کو جائز قرار دیا ہے۔ 20 دسمبر 2003ء کے اخبارات میں اس فیصلہ کی رپورٹیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ حنفی فقہاء کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے کہ وہ بالغ مرد و عورت کے نکاح کیلئے ولی کی اجازت کو ضروری قرار نہیں دیتے جب کہ باقی تینوں سنی مکاتب فکر کے آئمہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ بالغ کے نکاح کیلئے ولی کی اجازت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ نیز شیعہ مکتبہ فکر کے علماء بھی فقہائے احناف کی طرح بالغ کے نکاح کیلئے ولی کی اجازت کو لازمی نہیں سمجھتے۔ مالکیہ اور شوافع کے نزدیک ولی کی اجازت جواز نکاح کی شرط ہے جب کہ امام ابوحنیفہؒ، امام زفرؒ، امام شعبیؒ اور زہریؒ کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر بالغ عورت کا خود اپنی مرضی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ ان فقہاء میں سے داؤد زہریؒ کنواری

عورت کیلئے ولی کی اجازت لازمی قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ثیبہ (وہ عورت جو سابقہ نکاح کا تجربہ رکھتی ہو یعنی مطلقہ یا بیوہ) کیلئے ولی کی اجازت لازمی قرار نہیں دیتے۔ ان فقہاء نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر کو ثابت کرنے کیلئے بنیادی طور پر استدلال قرآن وسنت سے ہی کیا ہے۔ امام مالک کی ایک رائے یہ ہے کہ ولی کی اجازت وموجودگی فرض نہیں بلکہ مستحب ہے۔ علامہ ابن رشد نے مالکیہ کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ولی کی موجودگی جواز نکاح نہیں بلکہ تکمیل نکاح کیلئے ضروری ہے۔

جرگوں اور قبائل کے فیصلوں کی حیثیت

اب دیکھنا یہ بھی ہے کہ کیا قبائلی سرداروں کی پنچائیت کا فیصلہ بھی شرعی طور پر قابل عمل ہے یا نہیں۔ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے قبل عرب معاشرہ خود قبائلی نظام میں بٹا ہوا تھا۔ لیکن اسلام کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام قبائلی اور معاشرتی رسوم ورواج کو الہامی ہدایت کے تابع کر دیا۔ سوائے ان روایات کے جو اسلام کی روح سے متصادم نہیں تھیں۔ ان "Pre-Islamic Traditions" کو جاری رہنے دیا گیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قبائلی روایات خواہ ان کا تعلق کسی بھی خطہ ارض سے ہو، اگر روح اسلام سے مطابقت نہیں رکھتیں تو انہیں اسلام کے معاشرے میں کالعدم قرار دیا جائے گا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب عرب کے ایک معزز قبیلے خاندان بنو مخزوم کی فاطمہ نامی عورت چوری کا ارتکاب کرتی ہے اور اس کی حد کے نفاذ کا اعلان ہوتا ہے تو بعض طبقات قبیلے کی عزت وانا کو بچانے کیلئے بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس عورت پر حد کے نفاذ کی معافی کیلئے سفارش بھیجتے ہیں تو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں یہ تو فاطمہ بنت اسد ہے۔ بخدا اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ اس سے ثابت ہوا اگر قبائلی روایات شرعی قوانین سے متصادم ہوں تو

نہیں مسلم سوسائٹی کے لیگل سسٹم میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ جہاں تک شائستہ عالمانی کیس یا اس قسم کے دیگر کیسوں میں قبائلی روایات کا تعلق ہے کہ جرگوں کے سردار دوسرے قبیلے میں کسی بالغ بچی کے نکاح کو خلاف روایت سمجھتے ہیں تو از خود پنچائیت کے ذریعے اس کے فیصلے کرنے کی بجائے اس کے ایک سو ایک حل تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی قبائلی سردار کو کسی خاندانی روایت کے ٹوٹنے کا خدشہ ہے تو وہ طلب انصاف کیلئے باقاعدہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور عدالت از خود یا زیادہ حساس اور دینی نوعیت کا مسئلہ ہو تو علماء کے بورڈ سے مشورے کے بعد فیصلہ سنا سکتی ہے۔ شائستہ عالمانی اور اس جیسی کئی لڑکیاں قبائلی سرداروں کے ہاتھوں استحصال پر سراپا احتجاج بن کر کہہ رہی ہیں کہ

خود ہی قاتل، خود ہی شاہد، خود ہی منصف ٹھہرے
اقرباء میرے کریں خون کا دعویٰ کس سے

نتیجہ بحث

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں چونکہ زیادہ تر عدالتی فیصلے اور مفتیان عظام کے فتوے فقہ حنفی کے مطابق ہی دیئے جاتے ہیں اور فقہائے احناف کنواری اور ثیبہ دونوں کیلئے ولی کی اجازت کو لازمی نہیں سمجھتے۔ جبکہ بدلتے ہوئے حالات اس رائے میں تھوڑی سی تبدیلی کے متقاضی ہیں۔ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے سے ہمارے معاشرے میں بے شمار مسائل پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً جوان لڑکے اور لڑکیاں ذہنی ناپختگی کی بناء پر جذباتی فیصلے کر لیتے ہیں جس وجہ سے ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ بطور خاص دورِ حاضر میں مغربی ثقافتی وفکری یلغار کے نتیجے میں نوجوان نسل کو جس طرح دین سے دور کیا جارہا ہے ان حالات میں ولی کی نگہداشت (Cutody) اجازت (Permission) اور موجودگی (Presence)

کو لازمی قرار نہ دیا جائے تو اس کے بے شمار مزید نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مغرب کی مثال ہمارے سامنے ہے وہاں ولی (Gardian) کی اجازت کے بغیر شادی کے کیا نتائج نکل رہے ہیں اور ان کا خاندانی نظام (Family System) کس طرح تباہی کے دہانے پر پہنچ رہا ہے۔

اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہر صورت میں ولی کی اجازت کو لازمی قرار دینے کی صورت میں بھی قباحتیں جنم لے سکتی ہیں۔ ان کا حل بھی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کے نکاح کے وقت سے اجازت تو درکنار پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا جاتا اور جس لڑکے کے ساتھ اس کو نکاح کے بندھن میں باندھا جارہا ہے وہ علم، کردار، حسن اور دولت کے لحاظ سے کلی یا جزوی طور پر اس سے کم ہوتا ہے۔ مشرقی روایات کی حامل لڑکی شرم وحیاء کے باعث اس استحصال پر احتجاج نہیں کرتی۔ نتیجتاً ذہنی، معاشی اور اخلاقی تفاوت کی بنا پر وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ''ایڈجسٹ'' نہیں کر پاتے اور جو لڑکی ایسے نکاح پر احتجاج کرتی ہے اسے خاندانی روایات کی باغی اور والدین کی نافرمان گردانا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام اسے اپنی پسند و ناپسند کی اجازت دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے؟ یہ بات تو طے ہے کہ دورِ حاضر کے حالات کے تناظر میں فقہ حنفی کے بعض مسائل کے حوالے سے اجتہاد کی اشد ضرورت ہے اور اس ضرورت کو اسلامی نظریاتی کونسل جیسا ادارہ بہتر طریقے سے پورا کرسکتا ہے۔ میرے نزدیک حالاتِ حاضرہ میں اس مسئلے کی قابل عمل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ علامہ داؤد ظاہری کی رائے کو ایک پہلو سے ترجیح دی جائے یعنی کنواری عورت کیلئے ولی کی اجازت بعض شرائط کے ساتھ لازمی قرار دی جائے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''بیوہ کا نکاح اس سے مشورہ کیے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری کی اجازت

ضروری ہے۔ لوگوں نے پوچھا اس کی اجازت کیسے ہوگی آپ نے فرمایا وہ خاموش رہے تو یہی اس کی اجازت ہے۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "بیوہ اپنا فیصلہ خود کرسکتی ہے اور کنواری سے اجازت لینی چاہیے" بنت خزام کہتی ہیں کہ وہ بیوہ ہوئیں تو ان کے والد نے ان کا نکاح کر دیا۔ انہیں یہ فیصلہ پسند نہ آیا چنانچہ وہ حضورِ اکرم ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے انہیں نکاح ختم کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ کنواری کیلئے تو اجازت ضروری ہو لیکن ثیبہ کو اس شرط سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ لیکن کنواری عورت کیلئے ولی کی اجازت سے ولی کا جبر مراد نہ لیا جائے بلکہ اجازت مشورہ کی صورت میں ہو اور ولی اس عورت کا نکاح کرتے وقت اس کے معیار اور پسند و ناپسند کو لازمی پیش نظر رکھے پھر اس عورت کیلئے بھی لازمی قرار دیا جائے کہ وہ خاندانی حالات و معاملات کے مطابق کفو "Social Status" کا خیال رکھے پھر تکمیل و تحسین نکاح کیلئے علامہ ابن رشد کی رائے کے مطابق ولی کی موجودگی کو لازمی قرار دیا جائے۔ میرے نزدیک اس تناظر میں قانون سازی کی جائے تو اس سے نہ صرف خاندانی وحدت (Unit) میں استحکام پیدا ہوگا بلکہ بے شمار مسائل کے حل میں صرف نظری طور ہی نہیں بلکہ عملاً بھی مدد ملے گی۔

وما توفیقی الا باللہ العظیم

فون اور انٹرنیٹ پر نکاح کی شرعی حیثیت

اسلامی معاشرے اور نظامِ اجتماعی کی ابتداء خاندان کی بنیادی اکائی (Basic Unit) سے ہوتی ہے۔ خاندان کا آغاز مرد اور عورت کے درمیان ایک معاشرتی معاہدے (Social Contract) اور پاکیزہ ازدواجی بندھن (Wedlock) سے ہوتا ہے۔ یہی سلسلہ وسعت اختیار کر کے معاشرے کا روپ دھار لیتا ہے لیکن غور کیا جائے تو ساری معاشرتی زندگی کا انحصار اس بنیادی معاہدے پر ہوتا ہے جو میاں بیوی کے درمیان نکاح کی صورت میں طے پاتا ہے۔ اگر نکاح جیسا مقدس بندھن نہ ہو تو پھر معاشرتی زندگی اور خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ذہنی سکون کی غارت گری کا باعث بن سکتے ہیں کیونکہ انسانی زندگی میں سے نکاح نکال دیا جائے تو باقی حیوانی خواہشات کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ باوجود اس کے کہ نسل انسانی کا ارتقاء جاری رہتا ہے لیکن انسانی معاشرے میں طبقات انسانی کی بجائے حیوانوں کے ریوڑ چلتے نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں نکاح کو ''احصان'' کہا گیا ہے جس کا معنی قلعہ ہے۔ گویا نکاح وہ مضبوط حصار ہے جو مرد وعورت کے اخلاق کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کی جائز فطرتی خواہشات کی نکاح کے ذریعے قلعہ بندی کرتا ہے۔

نکاح کا معنی

لغت میں نکاح سے مراد اشیاء کو یکجا یا جمع کرنا ہے۔ ایک شے کی دوسری شے میں پیوست یا جذب ہو جانے پر بھی نکاح لفظ بولا جاتا ہے۔ بارش کا پانی زمین میں جذب ہو جائے تو اہل عرب کہتے ہیں ''نکح المطر الارض'' اس طرح جب درخت جھنڈ کی صورت میں ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں تو اہل عرب کہتے ہیں ''تنا

کحت الاشجار' یعنی درخت ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

نکاح کا شرعی معنی

شرح میں نکاح سے مراد عقد ہے جس کا معنی گانٹھ یا گرہ لگانا ہے۔ چونکہ مرد وعورت نکاح کے ذریعے ایک بندھن میں باندھ دیئے جاتے ہیں اس لیے نکاح کو عقد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اصطلاح میں نکاح سے مراد مباشرت (Sexual Relationship) بھی لی جاتی ہے۔

نکاح کی تعریف

ہدایہ میں نکاح کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے جس کا مقصد جائز اولاد پیدا کرنا ہے۔ کنز الدقائق میں نکاح کو ایک ایسا معاہدہ کہا گیا ہے " جو عورت سے حصول تمتع کی خاطر مالک ہونے کیلئے کیا جاتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری اور شرح وقایہ میں بھی نکاح کے بارے میں یہی کہا گیا ہے۔

"النکاح عقد یرد علی ملک المتعته قصدًا" [1]

ملک شام کے عائلی قوانین میں نکاح کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"الزواج عقد بین رجل وامرأة تحل له شرعاغایة انشاء رابطة للحیاة المشترکة والنسل" [2]

نکاح مرد وعورت کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس سے عورت مرد کیلئے حلال ہو جاتی ہے اور اس کا مقصد باہمی زندگی اور توالد و تناسل کا رشتہ پیدا کرنا ہے۔ جسٹس قدیر الدین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نکاح محض ایک دیوانی معاہدہ ہی نہیں بلکہ مذہبی معاہدہ بھی ہے۔ مذکورہ بالا نقطہ نظر کی روشنی میں نکاح کی اصل تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ نکاح ایک دیوانی (Civil)، عمرانی (Social)، قانونی (Legal) اور روحانی (Spirtnal) معاہدہ (Contract) ہے۔ جس کے ذریعے اجنبی مرد وعورت ایک

جائز ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوکر باہم حقوق وفرائض کی ادائیگی کے پابند ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے فقہانے نکاح کو عبادات اور معاملات دونوں میں شمار کیا ہے۔

نکاح حکم شرعی ہے

نکاح ایک حکم شرعی ہے جس کی بجا آوری ضروری ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی ای لیس علی طریقتی '' [3]

ترجمہ: نکاح میری سنت ہے۔جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں یعنی وہ میرے طریقے پر نہیں۔

منگنی کا تصور

اسلام میں نکاح سے قبل منگنی کا تصور ہے جس کو عربی زبان میں خِطبہ کہتے ہیں۔منگنی شادی کا دیباچہ ہوتا ہے۔منگنی شرعاً جائز بلکہ مستحسن ہے۔اس میں حکمت یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ جان لیں کہ فلاں عورت کس مرد کے ساتھ منسوب ہے۔لہٰذا وہاں کوئی نکاح کا پیغام نہ بھیجے۔حدیث پاک میں ہے

''اذا خطب احدکم امراۃ فان استطاع ان ینظر منھا مایدعوہ الی نکاحھا فلیفعل'' [4]

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی منگنی کرے تو اگر اس سے ہو سکے تو اس عورت کو دیکھ لے تاکہ اسے پتہ چلے کہ کونسی جائز چیز اس کو اس نکاح کیلئے رغبت دلانے والی ہے۔

فون اور انٹرنیٹ پر نکاح کی بنیاد

نکاح میں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میاں بیوی وقت نکاح ایک جگہ پر موجود نہیں ہوتے۔حالانکہ نکاح کے وقت مرد وعورت کا ایک جگہ پر موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔اتحادِ مجلس والی شرط کے اگر تقاضے پورے کر دیئے جائیں تو مرد وعورت

کے ایک دوسرے کے سامنے موجود نہ ہونے کے باوجود نکاح سنت طریقہ کے مطابق ہی ہوگا کیونکہ اتحاد مجلس کی شرط پوری ہوسکتی ہے۔ میاں بیوی کے وکیل اگر مجلس میں موجود ہوں تو شرط پوری ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو نکاح حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا وہ مدینہ طیبہ سے دور حبشہ (ایتھوپیا) کے مقام پر بادشاہ نجاشی کے ذریعے ہوا تھا۔ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر بھی شاہِ حبشہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ادا کیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نکاح میں اصل چیز اعلان ہے تاکہ افرادِ معاشرہ کو پتہ چل جائے کہ فلاح مرد و عورت ایک جائز ازدواجی معاہدے میں منسلک ہو گئے ہیں۔ دیگر عقود کی طرح نکاح بھی ایک شرعی وقانونی عقد (Legan & Sharia Contract) ہی ہے۔ جب دیگر عقود جدید ذرائع ابلاغ (فون، انٹرنیٹ، ای میل اور فیکس) کے ذریعے منعقد ہو سکتے ہوں تو عقد نکاح بھی تمام شرعی لوازمات کی موجودگی میں ان ذرائع سے منعقد ہوسکتا ہے۔

نکاح کا بنیادی رکن

نکاح کا بنیادی رکن طرفین کی مرضی کا اظہار ہے کہ وہ دونوں ایک مقدس بندھن میں آنا چاہتے ہیں۔ اس مرضی کا اظہار فقہی اصطلاح میں ایجاب وقبول کہلاتا ہے۔ پہلی پیشکش کو ایجاب (offer) کہتے ہیں چاہے وہ لڑکی کی طرف سے ہو یا لڑکے کی طرف سے اور اس کے مثبت جواب کو قبول (Acceptance) کہتے ہیں۔ اس ایجاب وقبول کی چند شرائط ہیں جن میں سے ایک یہ ہیکہ ایجاب وقبول ایک ہی مجلس (session) میں منعقد ہو اگر ایک طرف سے ایجاب ہو اور مجلس برخاست ہو جائے اور دوسری مجلس میں اس کا قبول کیا جائے تو نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ قابل غور ایجاب وقبول کا اظہار اشارے اور کنایہ سے ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے گونگا شخص بھی

اپنی مرضی کا اظہار اشارے سے کرے تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے جبکہ بعض حنفی فقہاء کے نزدیک گونگا شخص اگر لکھ سکتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی مرضی لکھ کر بتائے۔ اس صورت میں اس کا اشارہ قبول نہیں کیا جائے گا لیکن اتحادِ مجلس ضروری ہے۔ اب اگر ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر مجلس واحد کا خیال رکھا جائے کہ ایجاب وقبول دونوں ایک ہی مجلس میں ہوں دونوں اطراف میں میاں بیوی کے وکیل ٹیلی فون نک نکاح کے وقت موجود ہوں۔ خاص طور پر اگر دونوں اطراف میں ایسے ٹیلی فون استعمال کیے جائیں جن میں آواز ایک کی بجائے سب لوگ سن سکیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح انٹرنیٹ پر تو آواز کے ساتھ تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے اگر اس بات کی تصدیق کر لی جائے کہ جو شخص ایجاب وقبول کر رہا ہے یہ اس کی آواز ہے مثلاً دولہا انگلینڈ میں اور دلہن پاکستان میں ہو اور دولہا ایجاب وقبول کرتا ہے اور پاکستان میں اس کی آواز سننے والے افراد گواہوں کی موجودگی میں اس بات کی تصدیق کر دیں کہ یہ اسی شخص کی آواز ہے تو ایسا نکاح درست ہوگا۔ اسی طرح اگر انٹرنیٹ پر برطانیہ میں بیٹھے ہوئے شخص کی تصویر بھی نظر آ رہی ہو اور آواز بھی سنائی دے رہی ہو تو یہ اتحادِ مجلس کی ہی صورت ہوگی اور ایسا ایجاب وقبول درست ہوگا۔ اور زیادہ محتاط صورت یہی ہو سکتی ہے کہ دولہا یہاں پاکستان میں ایک شخص کو اپنا وکیل مقرر کرے تو اس کی طرف سے ایجاب وقبول ہی دولہے کا ایجاب قبول سمجھا جائے گا جبکہ ایسے شخص (وکیل) کے اختیارات صرف ہاں تک محدود رہیں گے۔

گواہوں کی موجودگی

مجلس نکاح میں دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے جو اس بات کی تصدیق کریں کہ فلاں مرد وعورت کے درمیان شرعی تعلق قائم ہو گیا ہے۔ قاضی برہان الدین علی ابن ابی بکر المرغیتانی (متوفی 583ء) نے اپنی مستند کتاب ''ہدایہ'' کی کتاب

''النکاح'' میں گواہوں کی موجودگی کو نکاح کے جواز کی شرط کہا ہے۔ ان کے علاوہ قاضی خان نے کتاب النکاح کی ''شرائط نکاح'' میں اور الکاسانی نے بدائع الصناع میں گواہوں کی موجودگی کے بارے میں لکھا ہے۔

''ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاھدین حرّین بالغین عاقلین مسلمین او رجل واحد وامراتین'' 5

سوائے مالکیہ کے فقہائے احناف، شوافع اور حنابلہ گواہوں کی موجودگی کو جواز نکاح کی شرط قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث مبارک ہے

لایجوز نکاح بغیر شاھدین

(دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا)

اب گواہوں کو ٹیلی فون یا انٹرنیٹ پر ہونیوالے ایجاب وقبول کو سننا چاہیے۔ اگر گواہ اس بات کی تصدیق کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں مرد وعورت کی آوازیں ہیں یا وہ فریقین کے وکلاء کے ایجاب وقبول کو سن لیتے ہیں تو گواہی کی شرط پوری ہو جائے گی اور ایسا نکاح ہر اعتبار سے درست ہوگا۔

نکاح کے بعد ولیمہ کرنا

نکاح کیلئے ولیمہ بھی کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔

''ولیمہ کرو چاہے ایک بکری سے ہوتا کہ نکاح کا اعلان ہو جائے۔''

اب ولیمہ میں بھی اصل حکمت اعلانِ نکاح ہے اور یہ نکاح کے وقت نہیں بلکہ رخصتی کے وقت کیا جاتا ہے۔ اگر نکاح ٹیلی فون یا انٹرنیٹ کے ذریعے ہوا ہو تو بیرونِ ملک مقیم شخص وہاں اپنے دوست واحباب کو ولیمہ دے دے تو سنت ادا ہو جائے گی۔ کیونکہ ولیمے کیلئے کسی جگہ کا تعین نہیں کیا گیا۔ مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ

بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ فون اور انٹرنیٹ پر نکاح ہونے میں ایسا کوئی شرعی عذر مانع نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جائے کہ یہ نکاح جائز نہیں ہے لیکن ایسا نکاح صرف ضرورت اور حاجت کے وقت ہی جائز ہوگا۔ محض فیشن کی بنا پر اس نکاح کو مستحسن نہیں سمجھا جائے گا بلکہ ضرورت کے تحت تو فون اور انٹرنیٹ کے علاوہ ٹیپ ریکارڈر اور فیکس یا قاصد کے ذریعے کیا ہوا نکاح بھی جائز ہوگا۔

جسٹس تنزیل الرحمٰن ''مجموعہ قوانین اسلام صفحہ نمبر 121,120 جلد اوّل پر لکھتے ہیں کہ ''اگر عورت کراچی میں ہے اور مرد لاہور میں ہے مرد لاہور سے بذریعہ قاصد یا خط عورت کو مطلع کرتا ہے کہ میں تم سے نکاح کرتا ہوں اور عورت جواباً دو گواہوں کی موجودگی میں یہ بیان کرتی ہے کہ فلاں شخص نے مجھے قاصد یا خط کے ذریعے پیغامِ نکاح بھیجا ہے اور میں نے اسے قبول کرلیا ہے تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔ اس طرح مستند تحریر یا ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے کیا ہوا ایجاب مجلس عقد میں گواہوں پر ظاہر کر کے فریق ثانی کی طرف سے نکاح کا قبول ہوسکتا ہے بشرطیکہ قبول کے وقت ایجاب بھی گواہوں کی موجودگی میں بیان کر دیا گیا ہو کیونکہ قبول کے وقت ایجاب کے اظہار سے مجلس عقد متحد خیال کی جائے گی''۔ ٦

مندرجہ بالا عبارت کی روشنی میں اگر قاصد یا خط کے ذریعے گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے نکاح ہو جاتا ہے تو پھر فیکس اور ای میل کے ذریعے بھی گواہوں کی موجودگی میں اس بات کا یقین کر لینے کے بعد کہ ایجاب وقبول کرنے والے وہی مخصوص افراد ہیں۔ نکاح شرعاً منعقد ہو جائے گا لیکن بربنائے احتیاط ہر صورت میں وکلاء کی تقرری دونوں اطراف میں شرکت کی منشا کی تکمیل کیلئے ضروری ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مصادر و مراجع

۱۔ فتاویٰ عالمگیری، شرح وقایہ

۲۔ شام کے عائلی قوانین

۳۔ المبسوط صفحہ نمبر 193

۴۔ ترمذی کتاب النکاح

۵۔ شرائط نکاح، بدائع الصنائع

۶۔ مجموعہ قوانین اسلام صفحہ نمبر 121,120 جلد اوّل

غیرت کے نام پر قتل کی شرعی وقانونی حیثیت

''غیرت کے نام پر قتل'' ہمارے معاشرے کا ایک قابل ذکر باعث تشویش اور حل طلب مسئلہ ہے جس پر اب تک مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں۔ انسانی حقوق کی ملکی وغیر ملکی تنظیموں نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ اچھالا ہے اور عورتوں کے حقوق کی آڑ میں اسلام کے آفاقی قوانین اور پاکستان کے معاشرتی رویوں پر تابڑ توڑ حملے کیے ہیں کچھ عرصہ قبل انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں بطورِ خاص یہ ذکر کیا گیا ہے کہ پاکستان میں جب بھی عورت اپنے حقوق کی بات کرتی ہے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے بلکہ بسا اوقات قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ (بحوالہ دی نیوز 3 اکتوبر 1999ء) اس رپورٹ کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

"Every year in Pakistan hundreds of women of all ages and in all parts of the country, are reported killed in the name of honour."

کچھ عرصہ قبل سینٹ میں اس مسئلہ کے بارے میں کافی بحث وتکرار ہوئی۔ سینٹ میں ''غیرتی قتل'' کے خلاف ایک مذمتی قرارداد منظوری کیلئے پیش کی گئی۔ حکمران جماعت کے سینیٹروں نے خاموش مخالفت کی جب کہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے سینٹ کے اوکان نے غیرتی قتل کو تہذیبی روایت اور قبائلی رسم کا حصہ قرار دے کر قرارداد کی مخالفت کی جبکہ بعض سینیٹروں نے اس نوعیت کے قتل کا

مذہبی جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ پر اہل فکر و نظر میں کس قدر تشویش پائی جاتی ہے۔

کیا غیرت کے نام پر قتل اور قتل عمد برابر ہیں؟

انسانی حقوق کی تنظیموں کا مؤقف یہ ہے کہ غیرت کے نام پر قتل اور قتل عمد قانون اور شریعت کی نظر میں برابر ہیں حالانکہ جرم و سزا کے فلسفہ کے متعلق واجبی سا علم رکھنے والا شخص بھی اس نقطہ نظر کی نامعقولیت کا ادراک کر سکتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی ریاست کا قانونی و عدالتی نظام جرائم کے پس پشت محرکات اور اسباب کا تعین کیے بغیر ان کی سزا کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔ مزید برآں فوری اشتعال (Sudden Provocation) کے نتیجے میں کیے جانے والے جرئم کو عام جرائم سے ہمیشہ مختلف درجہ میں رکھا جاتا ہے۔ یہ معاملہ صرف قبائلی روایتی یا اسلامی معاشروں کا ہی نہیں بلکہ یورپی ممالک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب غیرت کے نام پر قتل اور قتل عمد کے عوامل (Factors) یکساں نہیں ہوتے تو پھر ان کی سزا کیسے یکساں ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایسا کرنا تقاضائے عدل کے منافی ہے۔ ویسے بھی اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو ایک باپ اپنی بیٹی یا ایک بھائی اپنی بہن کے قتل کے بعد اپنے آپ کو ایک اذیت ناک صورتِ حال بلکہ سزا سے دوچار کر لیتا ہے جو اس کیلئے یہ (Self inflicted) سزا ہی کافی ہوتی ہے۔

عالم اسلام کے کسی بھی ملک میں ''غیرتی قتل'' کو قتل عمد قرار دیکر قصاص کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ بعض اسلامی ممالک ایسے ہیں جہاں مغرب زدہ طبقہ حکمران ہے۔ وہاں بھی غیرتی قتل کو قتل عمد سے مختلف سمجھا جاتا ہے اور اس کی سزا میں تخفیف یا استثناء کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے۔

مثلاً اردن کے مجموعہ تعزیرات 1960ء کے آرٹیکل 340 کے الفاظ یہ ہیں

''کوئی شخص جو اپنی بیوی یا محرمات میں سے کسی ایک کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ بدکاری (زنا) کرتے ہوئے اچانک پکڑ لے اور وہ ان میں سے ایک یا دونوں کو قتل یا زخمی کر دے تو وہ ہر طرح کی سزا سے مستثنیٰ ہے۔(حوالہ ملاحظہ فرمائیں)

(Source: Islam and Feminism, chapter crime of honour and construction of Gender in Arab societies)

اسی اردن کے مجموعہ تعزیرات کے مذکورہ آرٹیکل سے ملتی جلتی دفعات نہ صرف تمام عرب ممالک کے مجموعہ تعزیرات میں شامل ہیں بلکہ ترکی اور بہت سے یورپی ممالک میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔مثلاً سپین اور پرتگال میں ایسی دفعات اب تک ان کے قانونی ڈھانچے کا حصہ ہیں جن میں غیرت کے سبب سے قتل کے نتیجہ میں قاتل کو سزا میں تخفیف یا استثناء کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

تاہم عرب ممالک کے مجموعہ ہائے تعزیرات میں ان امور کی تشریح میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے۔مثلاً کچھ نے اس کے نفاذ کو بدکاری کی عملی صورتوں تک محدود کر دیا ہے۔جن میں مصر، تیونس، لیبیا اور کویت وغیرہ شامل ہیں اور ایسی صورت میں وہ سزا میں صرف کمی کو ہی روا سمجھتے ہیں نہ کہ مکمل رعایت (Exemption) کو۔جبکہ بعض دوسرے اسلامی ممالک کے قوانین اس کے نفاذ کیلئے ناجائز بستر (Unlawful Bed) تک اس کو وسعت دیتے ہیں مثلاً شام اور لبنان وغیرہ۔

مذکورہ اختلافات اپنی جگہ لیکن یہ امر واضح ہے کہ کسی بھی اسلامی ملک میں غیرت کی وجہ سے کیے جانے والے قتل کو قتل عمد سمجھتے ہوئے قاتل کو قصاص کے طور پر موت کی سزا نہیں دی جاتی۔

مذکورہ بالا موقف رکھنے والوں میں سے اکثریت انسانی حقوق کے نام نہاد ٹھیکیداروں اور مغرب سے مرعوب زدہ طبقہ کی ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جو ویسے تو اسلام

کی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں اور اسلامی قوانین کے مقابلہ میں مغربی قوانین کو ترجیح دیتے ہیں اسے ان لوگوں کا احساس کمتری کہیں یا مغرب کے سامنے اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ روّیہ۔ حالانکہ خود مغربی اسکالر پیغمبر اسلام ﷺ کی قانون سازی اور اسلامی قانون کی آفاقیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں مثلاً ایک مغربی مفکر ولسن آر۔ کے لکھتا ہے:

In Islam the most conspicuous fact about Muhammad (peace be upon him) is that he was not merely a divine prophet but also a temporal ruler who governed, judged, punished and legislated. After the great flight in A.D.622 to Madina, when Muhammad (peace be upon him) acquired political power he was sovereign as well as divine prophet but only sovereign because of his prophetic office. The mosque was his council - chamber and hall of audience, the friday sermon his opportunity for declarations of policy and when he uttered his most preaching injunctions he spoke as the very mouthpiece of the deity.

(ترجمہ) حضرت محمد ﷺ کا نمایاں ترین وصف یہ ہے کہ آپ محض پیغمبر ہی نہ تھے بلکہ ایک ایسے حکمران تھے جو حکومت کی مسند انصاف پر متمکن ہوئے۔ لوگوں کو ان کے جرائم پر سزائیں دیں اور قانون سازی کی۔ 622ء میں ہجرت مدینہ کے بعد جب آپ کو سیاسی قوت حاصل ہوگئی تو آپ منصب رسالت کے ساتھ ساتھ مقتدر اعلیٰ بھی تھے لیکن آپ کا مقتدر اعلیٰ ہونا منصب رسالت کے ساتھ مختص تھا۔ مسجد آپ کی سرگرمیوں کا محور اور عوامی اجتماع کا مرکز تھی۔ خطبہ جمعہ آپ کی پالیسیوں کے اعلان کا

ذریعہ ہوتا تھا اور جب آپ کی زبان اقدس سے مختلف احکامات جاری ہوتے وہ بے مثل فہم و بصیرت کے آئنہ دار ہوتے تھے۔ مغربی مفکر کے اس اعتراف کے بعد اب ان مذکورہ لوگوں کیلئے لازم ہے کہ وہ اسلام کے عالمگیر قوانین کی تاویلیں کرنے کے بجائے ان کی عظمت کو دل و جان سے قبول کریں کیونکہ اسی میں ان کی اور انسانیت کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

عزت کے جرائم میں فائدہ اٹھانے کا مستحق کون ہے؟

غیرت کے جرائم میں یہ پہلو اہم ہے۔ عرب ممالک میں اس مسئلہ کے ماہرین قانون، فاضل علماء اور عدالتوں کے قاضی صاحبان تواتر سے اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں۔ شام اور لیبیا کے قوانین کے مطابق خاوند، بیٹا، باپ اور بھائی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اردن میں مذکورہ بالا چار رشتوں کے علاوہ دیگر محرم مرد عزت کے جرائم میں سزا کی کمی کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ مصر اور کویت اور تیونس کے مجموعہ ہائے تعزیرات نے شادی شدہ عورت کی صورت میں اس رعایت کو صرف خاوند تک محدود رکھا ہے۔ جب کہ الجیریا کے قانون میں ''عزت کے جرائم'' کی رعایت کے ضمن میں خاوند کے ساتھ بیوی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اگر تفکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ غیرت کے جرائم میں سزا کی کمی یا مکمل رعایت حکمت سے خالی نہیں ہے۔

اسلام نے صرف قتل عمد میں حد جاری کرنے کا حکم دیا ہے جبکہ غیرت کے قتل میں صرف تعزیر جو جج کے صوابدیدی اختیارات (Discitionery Powers) پر منحصر ہے کو ہی کافی سمجھا ہے۔ مصر کے معروف ماہر قانون شیخ عبدالحمید شاہ وربی نے غیرت کے جرائم کے بارے میں مصری کوڈ کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے

''مجلس قانون ساز نے ایسا خاوند جس کی آبرو کا جنازہ نکال دیا گیا ہو جو اس کی قیمتی ترین متاع تھی'' کی نفسیاتی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قانون سازی

(Legislation) کی ہے۔ اس لمحے جب وہ اپنی بیوی کو بدکاری کرتے ہوئے اچانک پکڑے گا بلاشبہ اس کے ہوش وحواس جاتے رہیں گے۔ نتیجتاً وہ اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کردے گا۔ (بحوالہ)

(Source: Feminism and Islam, Article on Aggravating and extenuating circumstances, Alexendria)

مندرجہ بالا تفصیلات سے قطعاً یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اسطرح ہر کوئی اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے بلکہ یہ تفصیلات اس لیے صفحہ قرطاس کے سپرد کی گئی ہیں تاکہ یہ امر واضح ہو جائے کہ افراد کی اکثریت کبھی بھی ایسے قانون پر متفق نہیں ہوئی جو انسانیت کیلئے ہلاکت یا ننگ و عار کا باعث ہو بلکہ بعض مسلم ماہرین قانون نے مندرجہ بالا آرٹیکل پر عمل درآمد کیلئے تین شرائط کو ضروری قرار دیا ہے جن میں

1- ملزم کا مقتولہ سے رشتہ (خاوند، بیٹا، بھائی)
2- عورت کا بدکاری کرتے ہوئے اچانک رنگے ہاتھوں پکڑے جانا
3- قتل کا اقدام بدکاری دیکھنے کے فوراً بعد اور فوری اشتعال کا نتیجہ ہو۔

پاکستان کے مجموعہ تعزیرات (P.P.C) کے مطابق عزت کے قتل کو قتل عمد کی بجائے قتل خطاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تعزیرات پاکستان کی شق 300 میں بیان کیا گیا ہے۔

"Culpable homicide is not murder if the offender, while deprived of the power of self-control by grave and sudden provocation, Causes the death of the person who gave the provocation or causes the death of any other person by mistake

1860ء سے لے کر اب تک ان قوانین کی تعبیر و تشریح اور اطلاق میں

تسلسل پایا جاتا ہے۔ پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے سینکڑوں فیصلہ جات ریکارڈ پر ہیں جن میں غیرت کے قتل کو قتل عمد نہیں سمجھا گیا۔ اس کے حوالہ کے طور پر اس قسم کے سینکڑوں کیس ہیں لیکن ثبوت کے طور پر درج ذیل کیسز دیکھے جاسکتے ہیں۔

1) Federation of Pakistan US Hasan Khan PLD1989SC 633-674-676

2) Ghulam Yaseen V state, PLD 1994 Lahore SC 392

اسلامی قانون کی راہنمائی

اسلامی قانون جو ایک مکمل ظابطہ حیات (Code of life) ہے اور انسانی نفسیات کو بھی اعتماد میں لیتا ہے بھلا اس سلسلہ میں راہنمائی کیونکہ نہ کرتا۔ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے کہ آپ نے فرمایا ''میری امت سے تین چیزوں سے متعلق سوال نہ ہوگا خطاء، نسیان، اور اکراہ۔''

نیز ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا ''اگر میں کسی شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ (ناجائز حالت) میں دیکھ لوں تو اسے قتل کر دوں۔ آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایسا کرنے سے منع کیا اور نہ ہی اس پر اعتراض کیا بلکہ صحابہ کی حیرانگی کو دیکھ کر فرمایا

اتعجبون من غیرۃ سعد انا اغیر منه واللّٰه اغیر منی

''کیا تم لوگ سعد کی غیرت پر تعجب کرتے ہو جبکہ میں سعد سے زیادہ غیرت مند اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہے۔'' (الصحیح البخاری جلد ۳)

نیز واضح رہے کہ اسلامی قانون بھی کسی مرد کو اپنی محرم عورت کو کسی غیر محرم مرد کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھنے پر اسے قتل کرنے یا قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس کی مذمت کرتا ہے۔ تاہم اگر وہ فوری اشتعال کے نتیجے میں

ایسا کر ڈالے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا بلکہ تعزیری سزا ہوگی۔

نتیجہ: مندرجہ بالا احادیث اور مختلف اسلامی ممالک کے قوانین کے تقابلی جائزے کے بعد اس نتیجہ پر بآسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ یہ قانون فی نفسہ مفاد عامہ میں ہے مگر عوام معاشرتی و قبائلی رسوم و رواج کی بنا پر اس کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ہزاروں خواتین کو صرف شک وشبہ کی بنیاد پر موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے اور پھر ملزم اس قانون کا سہارا لے کر صاف بچ نکلتا ہے لہٰذا اس قسم کے مقدمات کا فیصلہ باریک بینی سے ہونا چاہیے۔

تاکہ معاشرے میں عورتوں کے قتل عام کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکا جا سکے۔ قتل فی ذاتہ کسی بھی معاشرے میں مستحسن عمل نہیں۔ چہ جائیکہ اسلامی معاشرہ میں جو ایک فرد کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ انسانی حقوق کے نام پر کسی بھی طبقہ کو اسلامی قوانین میں تغیر و تبدل یا حذف و اضافہ کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا اس بنا پر غیرتی قتل پر قتل عمد کے طور پر قصاص کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ کیس کی نوعیت کے پیش نظر صرف تعزیری سزا ہوگی جو کہ جج کے صوابدیدی اختیار پر منحصر ہوگی۔ نیز واضح رہے کہ صوابدیدی اختیار کی بنا پر ''کیس'' کی نوعیت کے پیش نظر پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے اور سزا سے مکمل نجات بھی اور ہلکی پھلکی سزا بھی۔ لہٰذا انسانی حقوق کے نام پر ''غیرتی قتل'' پر واویلا مچانے والوں اور اسے قتل عمد قرار دینے والوں کو شریعت اسلامیہ کے مزاج، عالمی اسلامی قوانین اور انسانی نفسیات کو پیش نظر رکھنا چاہیے ورنہ یہ دنیا شریعت مصطفیٰ کے فیضان، قوانین کی حدود اور انسانی احساسات و جذبات کے دائروں سے نکل کر اندھیر نگری بن جائے گی جس میں بسنے والے متنفس اشرف المخلوقات تو نہیں البتہ جانوروں کا ریوڑ ضرور نظر آئیں گے۔

یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ کا حقیقی وقانونی جائزہ

اسلام کے نظام میراث میں سے ایک ''حجب'' استعمال ہوتی ہے جس کا معنیٰ ہے کہ کسی ایک شخص کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کا مکمل طور پر یا جزوی طور پر وراثت سے محروم ہو جانا۔ جن ورثاء میں موانع وراثت جیسے قتل اور اختلاف دین وغیرہ میں سے کوئی پایا جائے ان کو ''محروم الورث'' کہا جاتا ہے۔

مانع اور حاجب میں فرق

اگرچہ علم المیراث میں منع اور حجب مترادف استعمال ہوتے ہیں لیکن ان میں معمولی سا فرق موجود ہے۔ جس مقام پر کوئی وارث وراثت سے حصہ پانے کی اہلیت سے محروم ہو جاتا ہے وہاں ممنوع الورث کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے لیکن جہاں اہلیت تو باقی ہوتی ہے مگر درمیان میں کوئی آڑ یا رکاوٹ (حجب) آجانے سے وہ شخص وراثت سے محروم ہو جاتا ہے چنانچہ اس کو محجوب الورث کہا جاتا ہے۔

یتیم پوتے، پوتی کی وراثت کا مسئلہ

موجودہ دور میں وراثت سے محروم ہو جانے والے لوگوں کی بحث میں جس مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ میت کے اپنی صلبی اولاد ہونے کے باوجود یتیم پوتے، پوتی، نواسے اور نواسی کی میراث کا مسئلہ ہے یعنی دادا یا نانا کے انتقال پر اس کے اپنے بیٹے کے موجود ہوتے ہوئے اس کے دوسرے مرحوم بیٹے یا بیٹی (جو میت کی زندگی میں وفات پا چکے ہوں) کی اولاد دادا یا نانا کے ترکہ سے وراثت کا حصہ

پانے کی مستحق ہوگی یا نہیں؟

شریعت اسلامیہ کا قانون

اسلام میں نبی کریم ﷺ سے لیکر بیسویں صدی کے آغاز تک اس مسئلہ پر امت کا اجماع رہا ہے کہ دادا یا نانا کے انتقال پر اگر اس کا کوئی بیٹا موجود ہو تو اس کے (دوسرے مرحوم) بیٹے یا بیٹی کی اولاد کو وراثت سے کوئی حصہ نہیں ملے گا اس مسئلہ پر اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب کے علاوہ شیعہ مسلک بھی متفق رہا ہے۔

پاکستانی قانون

چنانچہ پاکستان میں سب سے پہلے 3 دسمبر 1953ء کو پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں ایک بل (مسودہ قانون) پیش کیا گیا کہ بیٹے کی موجودگی میں (یتیم) اور بھائی کی موجودگی میں بھتیجے کو میراث کا حق دیا جائے ملک گیر مخالف کے باعث یہ بل منظور نہ ہو سکا۔

چنانچہ 1955ء میں حکومت پاکستان نے ایک عائلی کمیشن قائم کیا جبکہ مرکزی وصوبائی مقننہ کو صدارتی فرمان مجریہ 1958ء کے ذریعے توڑ دیا گیا۔ مارشل لاء کے دور میں آرڈیننس نمبر 8 بابت 1961ء کی دفعہ چار کے ذریعے پاکستان میں یہ قانون نافذ کر دیا گیا کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اپنے پیچھے ایسے لڑکی یا لڑکے کی اولاد چھوڑ جائے جو اس کی زندگی میں ہی انتقال کر چکے ہوں تو اس مرحوم لڑکے یا لڑکی کی اولاد وراثت سے حصہ پانے کی مستحق ہوگی (جو حصہ اگر وہ خود زندہ ہوتے تو انہیں ملتا)۔

فیملی لاز آرڈیننس کی دفعہ 4 کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

Section 4 - In the eventof the death of any son or daughter of the propositus before the opening of the succession of the children of such son or

daughter, it any, living at the time the succession opens, shall per stripes receive a share equivalent of the share wich such son or daughter, as the case may be, would hare receive if alive.

اس طرح پاکستان میں دیگر مسلم ممالک کے رائج الوقت قوانین ''وصیت واجبہ'' کے برخلاف پوتے پوتی نواسے اور نواسی کو اپنے باپ ماں (جو بھی صورت ہو) کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے ''وارث'' قرار دیا گیا۔

پاکستانی قانون میں بیان کردہ اس دفعہ میں زیر بحث مسئلہ کی عملی صورت کو ایک مثال کے ذریعے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

مثال

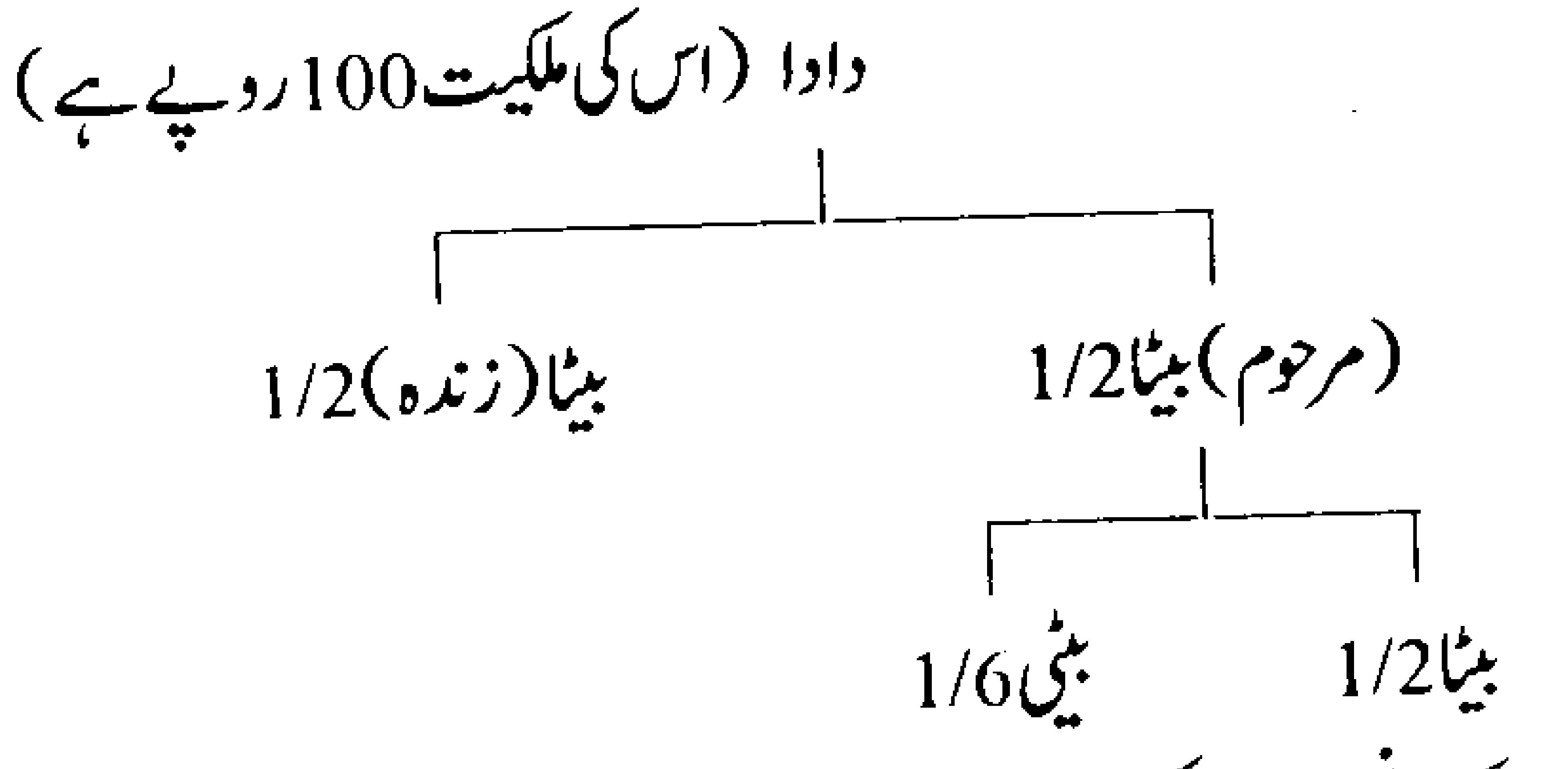

پاکستانی قانون کی رو سے مرحوم بیٹے کا حصہ دادا کی وفات کے بعد اس کی ملکیت سے زندہ بیٹے کو جانے کی بجائے مرحوم بیٹے کے بچوں کو چلا جائے گا اور بچے اپنے باپ کے قائم مقام وارث بن جائیں گے۔

یہ دفعہ پچھلے چودہ سو سال سے رائج اسلامی نظام میراث کے خلاف ہے۔

اب ہم اس دفعہ کا شرعی تجزیہ کرتے ہیں۔

دفعہ چار (۴) کا شرعی تجزیہ

اسلامی قانون وراثت کی رو سے دادا کے فوت ہو جانے کے بعد اس کی زندگی میں وفات پا جانے والے اس کے بیٹی کی اولاد کو اپنے دادا کی وراثت سے حصہ نہیں ملے گا بلکہ وہ حصہ بھی زندہ بیٹے کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

قرآنی آیات سے استدلال

سب سے پہلے ہم اپنے نقطۂ نظر کی تائید کیلئے آیاتِ قرآنیہ سے استدلال کرتے ہوئے اپنے موقف کی تائید میں دلائل پیش کریں گے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں کہ (ایک) بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے برابر ہے۔ [1]

اب مذکورہ بالا آیت کریمہ کے بارے میں اہل علم نے بڑی دقیق بحثیں کی ہیں کہ یہاں اولاد سے مراد صرف صلبی اولاد ہے یا اولاد کی اولاد یعنی پوتے اور پوتیاں یا نواسے اور نواسیاں بھی شامل ہیں۔ جمہور کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں اولاد سے مراد صرف حقیقی اولاد مراد ہے نہ کہ اولاد کی اولاد۔ چنانچہ یہاں اولاد میں پوتے اور پوتیاں شامل نہ ہوں گی اس کی دلیل یہ ہے کہ علم بلاغت اور علم فقہ کا ایک اصول ہے جو دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی تسلیم شدہ ہے کہ ایک لفظ سے ایک حالت میں مجازی اور حقیقی معنی میں سے صرف ایک معنیٰ میں مراد لیا جا سکے گا مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے شیر دیکھا تو اس کا حقیقی معنیٰ یعنی درندہ مراد ہوگا یا پھر مجازی معنیٰ یعنی بہادر انسان مراد ہوگا۔ دونوں معنیٰ بیک مراد نہیں لیے جا سکتے اور یہ اصول بھی ہے کہ عمومی طور پر لفظ سے اس کا حقیقی معنیٰ مراد لیا جائے گا مگر جب کسی قرینہ کی وجہ سے حقیقی معنیٰ

مراد لینا ممکن نہ ہو تو پھر اس لفظ سے مجازی معنیٰ بھی مراد لیا جا سکے۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیت کریمہ میں لفظ ''ولد'' کے حقیقی معنیٰ بیٹا، بیٹی مراد لیے جائیں گے۔ مجازی معنیٰ پوتا یا پوتی مراد نہیں لیے جاسکیں گے اور آیت کریمہ ''یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ'' کا مطلب یہ ہوگا کہ بیٹا ہوتے ہوئے پوتا پوتی کا وراثت سے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ چاہے وہ پوتا پوتی زندہ بیٹے سے ہوں یا مرحوم بیٹے سے ہوں۔

امام ابوبکر الجصاص نے اپنی کتاب میں لکھا ہے

''لم یختلف اهل العلم فی ان المراد بقولهٖ تعالیٰ ''یوصیکم اللّٰه فی اولادکم اولاد الصلب وانه انا لم یکن ولد الصلب فالمراد اولاد البنین دون اولاد البناتِ فقد انتظم اللفظ اولاد الصلب واولاد الابن ازالم یکن ولد الصلب'' ۲؎

ترجمہ: امت کے اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ میں صلبی اولاد مراد ہے اور اس میں بھی اختلاف نہیں کہ پوتا، پوتی صلبی اولاد میں شامل نہیں اور اس میں بھی اختلاف نہیں کہ جب صلبی بیٹا نہ ہو تو تب اس سے مراد بیٹوں کی اولاد ہے نہ کہ بیٹیوں کی اولاد۔ لہٰذا یہ لفظ صلبی اولاد کو اور جب صلبی اولاد نہ ہو تو بیٹے کی اولاد یعنی پوتے، پوتیوں کو شامل ہے۔

۲۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء میں ارشاد فرمایا

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۳؎

ترجمہ: اور ہر ایک لیئے بنا دیتے ہیں ہم نے وارث اس مال سے جو چھوڑ جائیں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ موالی عصبات ہیں اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ ۴؎

امام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کی تائید میں ایک حدیث مبارکہ بھی لکھی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا

''من مات وترک مالا مماله للموالی العصبة'' ۵

ترجمہ: جو شخص فوت ہو جائے اور مال چھوڑ جائے تو اس کا مال موالی یعنی عصبہ کیلئے ہے

اسی طرح لفظ اقربون اقرب کی جمع ہے اور اسم تفضیل ہے جو قرب سے بنا ہے اس کا معنی زیادہ قریب ہے لہٰذا جب عصبات والدین کے وارث ہوں یا دیگر عزیزوں کے وارث ہوں تو یہ وارث ہونے والے عصبات بھی وہ ہوں گے جو ان عزیزوں سے زیادہ قریب ہوں یہ قریب ہونا قرابت میں ہوتا ہے۔

اس بحث کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک نے ''القرب فالاقرب'' کا اصول قائم کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو پسند فرمایا ہے جیسا کہ

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ

والی آیت میں ''اقربون'' سے میت کے عام رشتہ دار مراد نہیں ہیں بلکہ وہ رشتہ دار مراد ہیں جو میت کے قریب تر ہوں اور ہم وراثت میں یہ اصول بھی کارفرما ہے کہ تقسیم وراثت کے وقت قریبی رشتہ دار (Closest Relative) دور کے رشتہ دار (Drstent Kinders) کو محروم کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس اصول کی رو سے بھی پوتا، پوتی بیٹا، بیٹی کی موجودگی میں محروم ہوں گے۔

احادیث نبوی اور فرامین صحابہ

صحاح ستہ میں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور بعض دیگر مجموعہ احادیث میں سے منقول ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا

''عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ ﷺ العقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلاولی رجل ذکر'' ۶

ترجمہ: کہ وراثت کے مقررہ حصہ ان کے حقداروں کو دو پھر جو بچے وہ میت کے سب سے قریبی مرد مذکر کیلئے ہے۔

اس حدیث پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ جس مرد کا رشتہ میت سے خود یا بواسطہ مرد کے ہے وہ عصبہ ہے اور اس کا حصہ قرآن مجید میں معین ومقرر نہیں۔ بیٹا، پوتا، بھائی اور چچا وغیرہ اور ان کی اولاد عصبات میں جن کا حصہ مقرر نہیں ہے لہٰذا ان میں سے جو میت کے قریب تر ہوگا وہ وارث ہوگا چنانچہ بیٹا پوتے سے اور بھائی بھتیجے سے قریب تر ہے اس لیے پوتے اور بھتیجے کے مقابلے میں بیٹا اور بھائی وارث ہوگا۔

شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں

''اجمعوا علی ان الذی یبقی بعد الفروض للعصبۃ یقدم الاقرب فالاقرب فلا یرث عاصب بعیدہ مع عاصب قریب والعصبۃ کل ذکر یدلی بنفسہٖ بالقرابۃ لیس بینہٗ وبین المیّتِ انثی فمتی انفرد اخذ جمیع المال'' ۷

ترجمہ: امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مقررہ حصہ پانے والوں کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ عصبہ کا ہے جو سب سے قریب عصبہ ہے وہ مقدم کیا جائے گا پھر وہ جو اس کے بعد سب سے قریب کا ہے (لیکن دور کا عصبہ قریب کے عصبہ کے ساتھ وارث نہیں ہوگا) اور عصبہ وہ مذکر ہے جو خود قرابت کا ایسا تعلق رکھتا ہو کہ اس کے اور میت کے درمیان مؤنث نہ ہو جب یہ تنہا ہوگا تو کل مال لے جائے گا۔

اسی طرح امام نووی شارح مسلم لکھتے ہیں

''قد اجمع المسلمون علی ان مابقی بعد الفروض فھو

للعصبات بقدم الاقرب فا القرب فلا یرث عاصب بعید مع وجود قریب" [8]

ترجمہ: کہ تمام مسلمان نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ مقررہ حصوں کے بعد جو کچھ بچے وہ عصبات کا ہے جو سب سے قریب کا ہے وہ مقدم کیا جائے گا پھر جو اس سے قریب کا ہوگا لہٰذا دور کا عصبہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں وارث نہ ہوگا۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں

"قال ...... ولا یرث ولد الابن مع الابن" [9]

کہ پوتا بیٹے کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔

علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری لکھتے ہیں

"وھذا الذی قالہ زید اجماع" [10]

کہ حضرت زید نے جو کچھ کہا ہے اس پر امت کا اجماع ہے۔

اسی طرح حضرت ربیع بن صبیح نے حضرت عطاء سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

"کان ابوبکر بقول الجراب مالم یکن دونہ اب کما ان ابن الابن ابن مالم یکن دونہ ابن" [11]

ترجمہ: کہ اگر میت کا باپ موجود نہ ہو تو میت کا دادا باپ کا درجہ پائے گا جس طرح کہ میت کا بیٹا موجود نہ ہونے پر پوتا بیٹا تصور کیا جائے گا۔

اسی طرح حضرت خارجہ ابن زید ابن ثابت رضی اللہ عنہم سے مروی ہے

"عن حارجہ بذزید عن ابیہ زید بن ثابت ان معانی زوی الفرائض واصولھا عن زید ابن ثابت واما التفسیر فتفسیر ابی الذناد وعلی معانی زید" [12]

ترجمہ: کہ علم فرائض کے اصول ومطالب وہ معتبر ہیں جو زید بن ثابت کے لیے گئے ہوں اور ان کی تفسیر وہ جو ابوالزناد سے حضرت زید کے مطالب پر مبنی ہو۔

اس روایت کے آخری حصے کے متن میں منقول ہے کہ حضرت زید بن ثابت نے فرمایا کہ ''میت کے بیٹوں کی اولاد کا مرتبہ جبکہ بیٹے موجود نہ ہوں میت کی اولاد کا مرتبہ ہوگا ان کی اولاد کے مرد اصل اولاد کے مرد کی طرح ہوں گے اور ان کی عورتیں صلبی اولاد کی عورتوں کے مرتبہ میں ہوں گی جس طرح وہ وارث ہوتے تھے اسی طرح یہ وارث ہوں گے اور جس طرح وہ حاجب یا محجوب ہوتے تھے یہ بھی اسی طرح حاجب اور محجوب ہوں گے۔ چنانچہ اگر میت کا بیٹا اور پوتا جمع ہو جائیں تو بیٹے مقابلے میں پوتے کو وراثت سے حصہ نہیں ملے گا اور اگر میت کی دو یا اس سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو پوتیوں کو کچھ نہیں ملے گا مگر یہ کہ پوتیوں کے ساتھ میت کا پوتا بھی پایا جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی روایات اور ان کے آثار سے یہ امر ثابت ہوگا کہ خیر القرون (عہد صحابہ) میں اس مسئلے میں کسی ایک صحابی کا اس موقف کے خلاف قول موجود نہیں ہے۔ تمام صحابہ کرام اس امر پر متفق تھے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوگا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے

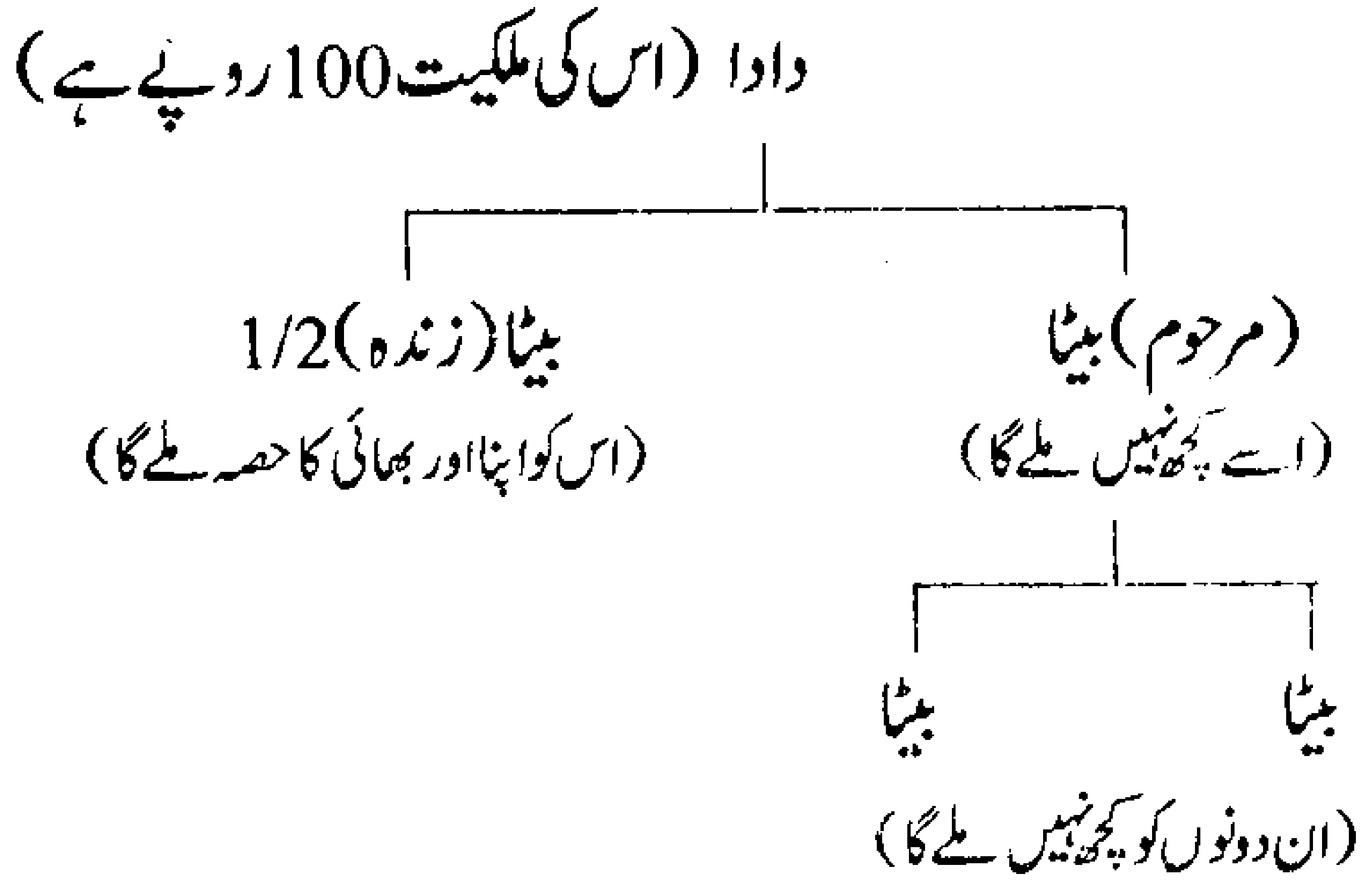

جدید مقننین (Legislatures) کا نکتۂ نظر

دور جدید کے بعض مقننین نے اس مسئلہ کو عقلی پیمانے اور کسوٹی پر پرکھ کر چودہ سو سال کے اجماع امت سے انحراف کرتے ہوئے یہ شور مچانا شروع کیا ہوا ہے کہ دیکھیں جی اسلام یتیم پوتے پر ظلم کا مرتکب ہو رہا ہے یعنی ایک طرف اس بیچارے کے سر سے باپ کی شفقت کا سایہ اُٹھ چکا ہے اور دوسری طرف اس کو وراثت سے محروم کر کے معاشی طور پر بدحال بنایا جا رہا ہے لہٰذا دورِ جدید کی ضرورت کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ یتیم پوتے کو وراثت سے حصہ دیا جائے۔

فیملی لاز آرڈیننس کی دفعہ 49 اسی سوچ کی عکاسی پر مبنی ہے۔

راقم اسطور چونکہ پچھلے پانچ سال سے لاء کالج کے اندر اسلامی اصول فقہ (Islamic Jurisprudence) اور مع فیملی قوانین (Muslim Family Laws or Muhammaden Law) کے مضامین بطور استاد پڑھا رہا ہے لہٰذا جب آغاز سال میں ہی ہم ان دفعات سے کتاب کا آغاز کرتے ہیں تو اس وقت بڑی شدید کوفت ہوتی ہے کہ ہم ایسی دفعات سے اسلامی قوانین کی تدریس کا آغاز کر رہے ہیں جو خود اسلام کے لیگل سسٹم کے خلاف ہیں چنانچہ میں اپنے طلباء کو سمجھاتا ہوں کہ جو لوگ انسان ساز (Man Made) قوانین کے ہی ماہر ہوں اور انہوں نے الہامی ہدایت سے روشنی حاصل نہ کی ہوں ان کے قلب ونظر سرمۂ افرنگ سے تو روشن ہوتے ہیں مگر خاک مدینہ ونجف سے وہ اپنی آنکھوں کو سرور نہیں بخشتے۔ ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے عقلی اور منطقی استدلالات اپنی جگہ مگر ہم اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ کو ایک طرف رکھ کر محض عقل کے غلام بنکر ربانی قوانین سے انحراف نہیں کر سکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حکم کا کوئی قول حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ورثاء کے حصے مقرر کر دیے ہیں جن کی رو سے بیٹا

کی موجودگی میں یتیم پوتا وراثت سے حصہ نہیں پاسکتا تو کیا کوئی اسکالر اور مقنن شریعت کی حکمتوں اور مصالح کو خلفائے اربعہ اور صحابہ کرام سے بڑھ کر بھی سمجھ سکتا ہے۔

پھر یہ بھی اصول ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر کسی دور کے آئمہ وفقہا اور مجتہدین کا اجماع ہو جائے تو اس اجماع کو منسوخ کرنے کیلئے اسی سطح کے اجماع کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ یقیناً صحابہ کرام کے بعد پوری امت مل جائے تو اجماع صحابہ کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم نظام عبادات اگر رب واحد کی عطا کردہ دستور حیات کے مطابق سرانجام دیتے ہیں تو ہمیں نظام معاملات اور قوانین بھی محض عقلی دوائر میں چلانے کی بجائے شارع (lawgiver) کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کے مطابق چلائیں اسی میں ہماری دینی، دنیوی اور اخروی نجات ہے۔

یتیم پوتے کے معاشی مستقبل کا مسئلہ

یہ صاحبان عقل وخرد یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر ہم شریعت محمدی کے اس اصول کو تسلیم کرلیں تو پھر اس یتیم پوتے کے معاشی مستقبل کا تعین کیسے کیا جاسکے گا؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جس رب نے ایک بچے کو رحم مادر میں زندگی بخشی ہے وہی اس کے معاشی مستقبل کا ضامن ہے مگر اب ان کے عقلی استدلال کا جواب شریعت کی عقلی تعبیرات کے ذریعے دیا جارہا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا حل (Council of Islamic Idiologt)

اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسئلے کا حل یہ تلاش کیا ہے کہ یتیم بچے کا چچا یا چچے پابند ہیں کہ وہ اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے کے معاشی معاملات کا خیال رکھیں کیونکہ انہوں نے وہ حصہ خود وصول کیا ہے جو اگر ان کا بھائی زندہ ہوتا تو اس کو ملنا تھا۔

"Uncles of orphans are duty bound to take care of orphan nephnews"

اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ

کہ وارث کو بھی اسی طرح حصہ دیا جائے گا۔

اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ح بھی یہ حکم موجود ہے کہ وراثت کے حصہ جیسا کہ قرآن پاک میں بیان کیے گئے ہیں وہ ان حصہ داروں کو دو جوان کے مستحق ہیں پھر ان میں سے جو کچھ بچ جائے وہ میت کے قریب ترین رشتہ داروں کو دو۔

فیڈرل شریعت کا پیش کردہ حل (Solution provided by F.J.C)

فیڈرل شریعت کورٹ نے بھی اس مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ دادا اپنے یتیم پوتے کے حق میں وصیت کر کے اس کے معاشی مستقبل کو تباہ ہونے سے بچا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں عدالتوں کو قرآن مجید کی سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۸۱ پیش نظر رکھنی چاہیے جس میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے انتقال کے وقت کچھ ورثاء کیلئے وصیت کر جائیں۔

آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیں

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ [۱۳]

تشریح: یہ حکم بھی ہے کہ ایک تہائی مال سے زیادہ وصیت نہ کرے اور مالداروں کو محتاجوں پر ترجیح نہ دے۔ ابتدائے اسلام میں یہ وصیت فرض تھی جب احکام وراثت نازل ہوئے تو اس وصیت کی فرضیت تو منسوخ ہوگئی البتہ ایک تہائی یا اس سے کم میں وصیت کرنا مستحب ہوگیا۔ یہ وصیت وارث کو بھی کی جاسکتی ہے اور غیر وارث کو بھی

بشرطیکہ غیر وارث کو کرنے کی صورت میں وارث محتاج نہ رہ جائیں یا ترکہ ملنے کے بعد محتاج نہ رہ جائیں۔

راقم الحروف کا نقطۂ نظر

اگر شریعت کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر قانون سازی کی جائے تو نہ صرف بے شمار قانونی موشگافیاں دور ہو سکتی ہیں بلکہ ہمارا معاشرہ نظام محمدی اور اسلامی قوانین کی برکات سے مستفیض ہو کر ایک یتیم نہیں کئی یتیموں اور غریبوں کی معاشی کفالت کا ضامن بن سکتا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مصادر و مراجع

۱۔ سورہ نساء پ ۴ آیت ۱۱
۲۔ احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۹۴
۳۔ پ ۵ سورہ نساء آیت ۳۴
۴۔ تفسیر جلالین از علامہ جلال الدین سیوطی ص ۱۲۷
۵۔ احکام للقرآن للجصاص۔ص ۲ ج ۲۲۳
۶۔ صحیح بخاری۔ج ۲ ص ۹۹۷
۷۔ فتح الباری از علامہ ابن حجر عسقلانی مطبوعہ معرج ۱۲ ص ۱۰
۸۔ صحیح مسلم مع شرح نووی ج ۱۱ ص ۵۳
۹۔ صحیح بخاری۔ج ۲ ص ۹۹۲
۱۰۔ عمدۃ القاری شرح بخاری۔ج ۱۱ ص ۱۹۷
۱۱۔ السنن الکبریٰ از احمد بن حسن البیہقی
۱۲۔ ایضاً ج ۶ ص ۲۲۹
۱۳۔ البقرہ:۱۸۱

ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی حیثیت

پاکستان کا حصول بنیادی طور پر ایک اسلامی نظریاتی مملکت کے قیام کیلئے عمل میں لایا گیا۔ 1973ء کے آئین میں یہ شق شامل تھی کہ ملکی قوانین کی اسلامائزیشن کے حوالے سے تدریجاً پیش رفت کی جائے بعد ازاں وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل جیسے ادارے اسی سلسلے کی کڑیاں تھی۔ اگرچہ یہ ادارے بھی کماحقہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں زیادہ اہم کردار ادا نہیں کر سکے تاہم کافی حد تک ان اداروں نے کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔ ان اداروں کے بھرپور کردار ادا نہ کرنے کے پیچھے متعدد عوامل تھے۔

کچھ عرصہ قبل میری اسلامی نظریاتی کونسل کے سابقہ چیئرمین جناب ایس۔ ایم زمان صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کیا وجہ ہے کہ آپ کی کونسل قوانین کی اسلامائزیشن کے حوالے سے ہمہ جہت کردار ادا نہیں کر سکی وہ فرمانے لگے "اصل میں ہم تو سفارشات بھیج دیتے ہیں لیکن قومی اسمبلی اور سینٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ذاتی مفادات اس راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔"

کچھ عرصہ قبل جب اسلامی نظریاتی کونسل کا اجلاس ہوا اور اس اجلاس کے ایجنڈے میں انسانی اعضاء کی پیوندکاری وعطیہ اور ولی کی اجازت کے بغیر نکاح جیسے مسائل شامل تھے تو میں نے اپنے فہم دین کے مطابق مناسب سمجھا کہ ان مسائل کو موضوع بحث بنا کر حقیقت تک رسائی حاصل کی جائے اور دورِ حاضر کے حالات کے تناظر میں ان کا قابل عمل حل پیش کیا جائے۔ نکاح میں ولی کی حیثیت کے حوالے سے ہمیشہ علماء وفقہاء میں اختلاف رہا ہے۔ بعض فقہا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کو مطلقاً

ناجائز قرار دیتے ہیں اور ولی کی اجازت کو نکاح کے جواز کی شرط قرار دیتے ہیں جبکہ بعض فقہاء ولی کی اجازت کو نکاح کیلئے لازمی نہیں سمجھتے۔ مثلاً مالکیہ اور شوافع کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک ولی کی اجازت جواز نکاح کیلئے شرط ہے جبکہ ابوحنیفہ امام زفر امام شعبی اور ظاہری کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر عورت کیلئے نکاح کرنا جائز ہے ان فقہاء میں سے داؤد ظاہری کنواری عورت کیلئے ولی کی اجازت لازمی قرار دیتے ہیں جبکہ ثیبہ (وہ عورت جو سابقہ نکاح کا تجربہ رکھتی ہو یعنی مطلقہ ہو یا بیوہ) کیلئے ولی کی اجازت لازمی قرار نہیں دیتے۔ ان تمام فقہاء نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر (Point of viwe) کو ثابت کرنے کیلئے بنیادی طور پر قرآن وحدیث سے ہی ستدلال کیا ہے۔ امام مالک کی ایک رائے یہ ہے کہ ولی کی اجازت وموجودگی فرض نہیں بلکہ مستحب ہے علامہ ابن رشد نے مالکیہ کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ولی کی موجودگی جواز نکاح نہیں بلکہ تکمیل نکاح کیلئے ضروری ہے۔

پاکستان میں چونکہ زیادہ تر عدالتی فیصلے اور مفتیان عظام کے فتوے فقہ حنفی کے مطابق ہی دیئے جاتے ہیں اور فقہائے احناف کنواری اور ثیبہ دونوں کیلئے ولی کی اجازت کو لازمی نہیں سمجھتے جبکہ بدلتے ہوئے حالات اس رائے میں تھوڑی سی تبدیلی کے متقاضی ہیں۔ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے سے ہمارے معاشرے میں بے شمار مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جوان لڑکے اور لڑکیاں ذہنی ناپختگی کی بنا پر جذباتی فیصلے کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ بطور خاص دورِ حاضر میں مغربی فکری وثقافتی یلغار کے نتیجے میں نوجوان نسل کو جس طرح دین سے دور کیا جا رہا ہے ان حالات میں ولی کی نگہداشت (Custody) اجازت اور موجودگی کو لازمی قرار نہ دیا جائے تو اس کے بے شمار مزید نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مغرب کی مثال ہمارے سامنے ہے وہاں ولی (Gardian) کی اجازت کے بغیر شادی کے

کیا نتائج نکل رہے ہیں اور خاندانی نظام (Family System) کس طرح تباہی کے دہانے پر پہنچ رہا ہے۔ وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہر صورت میں ولی کی اجازت کو لازمی قرار دینے کی صورت میں بھی جو قباحتیں جنم لے سکتی ہیں ان کا حل بھی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کے نکاح کے وقت اس سے اجازت تو درکنار پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا جاتا اور جس لڑکے کے ساتھ اس کو نکاح کے بندھن میں باندھا جا رہا ہوتا ہے اگر وہ علم، کردار حسن اور دولت کے لحاظ سے کلی یا جزوی طور پر اس سے کم بھی ہوتا ہے تو مشرقی روایات کی حامل لڑکی شرم وحیاء کے باعث اس استحصال پر احتجاج نہیں کرتی۔ نتیجتاً ذہنی، معاشی اور اخلاقی تفاوت کی بناء پر وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ''ایڈجسٹ'' نہیں کر پاتے اور جو لڑکی ایسے نکاح پر احتجاج کرتی ہے اسے خاندانی روایات کی باغی اور والدین کی نافرمان گردانا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام اسے اپنی پسند و ناپسند کی اجازت دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ دور حاضر کے حالات کے تناظر میں فقہ حنفی کے بعض مسائل کے حوالے سے اجتہاد کی اشد ضرورت ہے اور اس ضرورت کو اسلامی نظریاتی کونسل جیسا ادارہ بہتر طریقے سے پورا کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک حالات حاضرہ میں اس مسئلے کی قابل عمل صورت یہ ہو سکتی ہے کہ علامہ داؤد ظاہری کی رائے کو ایک پہلو سے ترجیح دی جائے یعنی کنواری عورت کیلئے ولی کی اجازت بعض شرائط کے ساتھ لازمی قرار دی جائے جبکہ ثیبہ کو اس شرط سے مستثنیٰ رکھا جائے لیکن کنواری عورت کیلئے ولی کی اجازت سے ولی کا جبر مراد نہ لیا جائے بلکہ اجازت مشورہ کی صورت میں ہو اور ولی اس عورت کا نکاح کرتے وقت اس کے معیار اور پسند و ناپسند کو لازمی پیش نظر رکھے اور پھر اس عورت کیلئے بھی لازمی قرار دیا جائے کہ وہ خاندانی حالات و معاملات کے مطابق کفو ''Social Status'' کا

خیال رکھے اور پھر تکمیل و تحسین نکاح کیلئے علامہ ابن رشد کی رائے کے مطابق ولی کی موجودگی کو لازمی قرار دیا جائے تو اس سے نہ صرف خاندانی وحدت (Unit) میں استحکام پیدا ہوگا بلکہ بے شمار مسائل کے حل میں صرف نظری طور پر ہی نہیں بلکہ عملاً بھی مدد ملے گی۔

حدود آرڈیننس پر اعتراضات کا علمی جائزہ

حدود آرڈیننس کی آڑ میں اسلامی قوانین کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا رواج بنتا جارہا ہے۔ حقیقت میں پاکستان کا اسلامی ونظریاتی تشخص ہمیشہ مغرب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہے۔ امریکہ کئی مرتبہ یہ مطالبہ کر چکا ہے کہ آئین پاکستان میں موجود اسلامی شقیں اقوام متحدہ کے عالمی منشور اور حقوق انسانی سے متصادم ہیں۔ پاکستان میں موجود مغرب کی فنڈنگ پر پلنے والی این جی اوز نے ہمیشہ حدود تعزیر، قانون توہین رسالت، اقلیتوں کے حقوق اور قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے والے قوانین کے خلاف زہر آلود پروپیگنڈہ کیا ہے۔

حدود آرڈیننس کا پس منظر

1977ء میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق کے اقتدار سنبھالتے ہی ملک میں اسلامائزیشن کا عمل شروع ہو گیا۔ دیگر امور کے علاوہ قوانین کی اسلامائزیشن پر خاصی پیش رفت کی گئی۔ حدود قوانین کو تجویز کرنے اور ترتیب دینے والوں میں شریف الدین پیرزادہ، اے کے بروہی، خالد ایم اسحٰق، اے کے ہمدانی، مولانا ظفر احمد انصاری، جسٹس مولانا تقی عثمانی اور ضیاء الامت جسٹس (ر) پیر محمد کرم شاہ الازہری جیسے قانونی ماہرین اور اسلامی علوم کے تبحرین شامل تھے۔ ان قد آور شخصیات نے 14 ماہ کی مسلسل محنت شاقہ اور بحث ونظر کے بعد حدود قوانین کے متعلق اپنی سفارشات کو حتمی شکل دی۔ اس سلسلہ میں شام کے ایک مشہور سکالر ڈاکٹر زرقا اور سوڈان کے سابق اٹارنی جنرل سے بھی رائے لی گئی۔ اس ساری جدوجہد کے نتیجے میں 1979ء ایک صدارتی آرڈیننس کے زریعے حدود قوانین کا نفاذ کیا گیا۔ ان

قوانین میں قذف (بہتان) چوری، ڈاکہ، شراب نوشی، زنا اور زنا بالجبر جیسے جرائم کی تعریف کا تعین کیا گیا اور ان پر حدود اللہ لاگو کی گئی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1. Prohibition/ enforcement of hadd order iv of 1974

یہ قانون شراب نوشی اور منشیات کے انسداد اور سزا سے متعلقہ ہے۔

2. The offences against property/enforcement of hudood ordinance No. vi of 1979.

یہ جائیداد سے متعلق جرائم (نفاذ حدود) کا قانون ہے۔

3. The offences of zina/enforcement of hudood ordinance No. viii of 1979.

جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس

4. The offences of qazf enforcement of Hudood ordinance No. viii of 1979.

جرم قذف (نفاذ حدود) آرڈیننس

5. Executive of whiphing ordinance 10 of 1979.

اجرائے سزا تازیانہ آرڈیننس

حدود آرڈیننس کے خلاف ہنگامہ خیزی کا اصل مقصد

حدود آرڈیننس کے خلاف سیکولر اور مغرب نواز طبقے کے شور شرابے اور ہنگامہ خیزی کا اصل مقصد تو پاکستانی معاشرے کو آزاد اور بے دین بنانا ہے تاہم اس مقصد کے حصول کے لیے حدود آرڈیننس میں سقم تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے کہ اس آرڈیننس پر تعمیری تنقید کر کے اصلاح طلب پہلو کا جائزہ لیا جائے لیکن اس کی آڑ میں اسلامی قوانین اور اسلام نظام معاشرت پر حملہ آور ہونا از خود سنگین جرم ہے۔ پاکستان کی مغرب نواز این جی اوز نے کئی مرتبہ صدر

جنرل پرویز مشرف کی زبان سے یہ بیان دلوایا ہے کہ ”حدود قوانین فرد واحد کے نافذ کردہ ہیں لہٰذا ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔اس سلسلہ میں جنرل پرویز مشرف نے ایک کمیشن بھی تشکیل دیا جس کا نام National commission on the status of women رکھا گیا جس کی چیئرمین پرسن جسٹس (ر) واجدہ رضوی کو مقرر کیا گیا کہ وہ حدود قوانین پر نظر ثانی کر کے ان کے متعلق جائزہ رپورٹ پیش کریں۔جسٹس واجدہ رضوی نے 2003ء کی آخری سہ ماہی میں اپنی جائزہ رپورٹ جنرل پرویز مشرف کو پیش کی جس میں کہا گیا کہ حدود قوانین میں تبدیلیوں سے عورتوں کے حقوق پر پڑنے والے منفی اثرات ختم نہیں ہو سکتے لہٰذا ان قوانین کو سرے سے ختم کر دینا چاہیے۔ یہ رپورٹ جس بھونڈے انداز میں تیار کی گئی اس کا انکشاف اسی کمیشن کے ایک اہم رکن اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق چیئرمین ڈاکٹر ایم ایس زماں نے یوں کیا کہ جسٹس واجدہ رضوی نے کراچی میں کمیشن کا ایک اجلاس ڈرامائی انداز میں یوں کیا کہ بعض اراکین سے پوچھا کہ بتائیں اس قانون کو منسوخ کیا جائے یا اس میں ترمیم کی جائے؟ اس اجلاس کے بیس دن بعد واجدہ رضوی نے جنرل صدر پرویز مشرف کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکثر ارکان نے ان قوانین کو منسوخ کرنے کی رائے دی ہے لہٰذا اس میں ترمیم کی بجائے اس کو منسوخ کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ بعد ازاں جون 2004ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں وزارت قانون کی طرف سے انکشاف کیا گیا کہ حکومت کے قانون سازی سے متعلق ادارے حدود قوانین میں ترمیم وتجاویز کے حوالے سے تیزی سے کام کر رہے ہیں جن پر عمل درآمد کی پیش رفت متوقع ہے۔اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کی ایک خاتون رکن قومی اسمبلی شیری رحمان نے قومی اسمبلی میں ایک بل جمع کرا رکھا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حدود قوانین کو منسوخ کیا جائے۔ یہ ساری صورتحال واضح کرتی ہے کہ حکومت کے اندر اور باہر ایسے

لوگ کثرت سے موجود ہیں جن کا مقصد اسلامی قوانین پر نہ صرف تنقید کرنا ہے بلکہ ان قوانین کو ختم کروا کر ان کی جگہ سیکولر قوانین کو نافذ کروانا ہے۔

حدود آرڈیننس پر اعتراضات

این جی اوز اور سیکولر طبقہ کی طرف سے حدود آرڈیننس پر ہونے والے اعتراضات درج ذیل ہیں۔

1- اسلامی نظریاتی کونسل حدود قوانین میں ترمیم کی وسعت تسلیم کر چکی ہے اور واجدہ رضوی کمیشن کے کچھ ارکان بھی ترامیم کے حق میں رائے دے چکے ہیں لہٰذا ان قوانین میں تبدیلی اور ترمیم کی مخالفت کا کوئی جواز نہیں ہے۔

2- یہ قوانین فرد واحد کی طرف سے نافذ کردہ ہیں لہٰذا ان میں ترمیم ضروری ہے۔

3- حدود زنا آرڈیننس میں عورت کو گواہی سے محروم رکھا گیا ہے اگر کسی عورت سے کسی ایسی جگہ زیادتی کی جاتی ہے جہاں کوئی مرد گواہ موجود نہ ہو اور صرف عورتیں ہی ہوں تو موجودہ قوانین کے تحت مجرم سزا سے بچ سکتا ہے۔

4- زنا اور قذف کے قوانین عیسائیوں کے ازدواجی قوانین سے متصادم ہیں لہٰذا یہ عیسائی مذہب میں مداخلت کے مترادف ہے۔

5- اسلامی قوانین کا اطلاق مسلمانوں پر ہونا چاہیے۔ غیر مسلموں پر اس کا اطلاق درست نہیں ہے۔

6- زنا آرڈیننس پر عملدرآمد کے دوران زنا یا زنا بالجبر کی تفریق کا خیال نہیں رکھا جاتا لہٰذا عورت ہر حال میں قانونی شکنجے میں پھنس جاتی ہے۔

7- دھوکہ دہی کا شکار ہو کر اغواء ہونے والی بے قصور خواتین کو بھی ان قوانین کی وجہ سے جرائم میں ملوث کر لیا جاتا ہے جو عورتوں کے ساتھ سراسر زیادتی ہوتی ہے۔

8- حدود قوانین بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہیں لہٰذا انہیں ختم کر دینا چاہیے۔

حدود قوانین پر اعتراضات کا علمی جائزہ

حدود قوانین پر ہونے والے تمام اعتراضات من گھڑت، بے وزن اور غیر معتبر ہیں تاہم چونکہ یہ لایعنی اعتراضات کر کے اسلامی قوانین پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی جاتی ہے لہٰذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان اعتراضات کا علمی محاسبہ کر کے اصل صورتحال واضح کی جائے یہ بات میں دوبارہ لکھ رہا ہوں کہ قوانین کے نفاذ و اطلاق کے طریقہ کار میں مثبت اور تعمیری تنقید اور اس کے نتیجے میں ان میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش تو بہر حال ہر قانون میں ہوتی ہے لیکن ترمیم کے بہانے سے قوانین کے خاتمے کا مطالبہ کرنا کسی طور پر درست نہیں ہے۔

جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ یہ قوانین عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا باعث بن رہے ہیں بالکل بوگس اعتراض ہے کیونکہ اس بات کو اگر تحقیق کے معیار پر رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ قوانین خواتین کو تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں امریکی پروفیسر چارلس ایچ کینڈی جو امریکی ریاست نارتھ کرولینا کی ویک فارسٹ یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کے شعبے سے وابستہ ہیں، کی تحقیق بھی قابل غور ہے جو انہوں نے اپنی کتاب اسلامائزیشن آف لاء اینڈ اکانومی کیس سٹڈیز آف پاکستان میں پیش کی اپنے تفصیلی تجزیے میں انہوں نے حدود قوانین کے بارے میں کئی نکات کی وضاحت کی ہے خصوصاً اس نکتے پر زور دیا ہے کہ یہ قوانین خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک پر مشتمل نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امتیازی سلوک تو کسی حد تک مردوں کے ساتھ بھی برتا گیا ہے۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن عدالتوں میں جن افراد کے خلاف حدود دفعات کے تحت مقدمات قائم کیے گئے اور ان کو سزا دی گئی ان میں 84 فیصد مرد ہیں ان میں سے جن کی سزاؤں کو وفاقی شرعی عدالت نے جرم قرار دے رکھا ہے وہ نوے فیصد مردوں کی سزائیں ہیں لہٰذا حدود

آرڈیننس میں خواتین سے امتیازی سلوک برتنے کا اعتراض کرنا دراصل عدالتی نظام، طریقہ کار اور کیسز کے فیصلہ جات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔

یہ اعتراض کرنا کہ اس آرڈیننس میں زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں فرق روا نہیں رکھا گیا ہے بالکل یک انہونی بات ہے۔ کیونکہ حدود آرڈیننس کے سیکشن 5 میں میں زنا کی الگ تعریف کی گئی ہے جبکہ زنا بالجبر کی الگ تعریف درج ہے۔ دونوں کے ثبوت کیلئے چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ شہادت کا طریقہ ایک ہے جبکہ سزا اور تعریف الگ الگ ہیں۔ وہ عورت جس سے زبردستی زنا کیا جائے اسلامی قانون میں اسے سزا سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اس کی دلیل ابوداؤد شریف کی وہ حدیث بھی ہے جس کو حضرت علقمہ بن وائل رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے ذرا مختلف الفاظ میں اس روایت کو بیان کیا ہے کہ ''عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک عورت نماز کیلئے نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اسے دیکھا اور اس پر غلبہ پالیا اور اپنے نفس کی پیاس بجھائی جب وہ چیخی چلائی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی اثناء میں ایک آدمی کا گزر اس طرف ہوا تو اس عورت نے اسے بتایا کہ اس شخص نے اس طرح سے اسے رسوا کیا ہے۔ پھر مہاجرین کی طرف سے ایک گروہ بھی اس طرف آنکلا۔ اس عورت نے انہیں بھی اپنی روئیداد سنائی تو وہ بھاگے اور اس شخص کو پکڑ لیا جس کے بارے میں اس عورت کا خیال تھا کہ اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے جب وہ اس شخص کو پکڑ کر عورت کے پاس لائے تو اس نے کہا ہاں اسی نے زیادتی کی ہے چنانچہ وہ اسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے تو آپ نے اسے سزا دینے کا حکم دے دیا۔ یہ دیکھ کر اصل مجرم کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول یہ میں تھا جس نے عورت سے زیادتی کی ہے اس پر آپ نے عورت سے فرمایا تو چلی جا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے معاف کر دیا ہے اور وہ جو شخص شبہ میں پکڑا گیا۔ اس سے کلمات خیر فرمائے پھر اس شخص کو جس نے عورت سے زنا بالجبر کا

اعتراف کیا تھا فرمایا اسے رجم کردو۔

تو یہ ہے زنا بالجبر کے بارے میں اسلام کا حکم لیکن اگر کسی عدالت نے دونوں کو سزا دے دی ہے تو اس میں عدالت کا قصور ہے یا تعبیر کی غلطی ہے۔ قانون میں تو سقم نہیں ہے۔

جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ حدود آرڈیننس میں عورت کو گواہی سے محروم رکھا گیا ہے درست نہیں ہے کیونکہ اگرچہ قرآن مجید میں سورہ نساء کی آیت نمبر 15 اور سورہ نور کی آیت 6 کی بنیاد پر جرم زنا کے ثبوت کیلئے چار گواہوں کی شرط رکھی گئی ہے۔

لیکن قانون شہادت 1984ء کے آرٹیکل 17 کی ذیلی دفعہ 2B کے تحت وضاحت کی گئی ہے کہ حد زنا کے نفاذ سے قطع نظر، زنا کے مقدمے میں عدالت ایک فرد یا ایک عورت کی گواہی پر تعزیز کی سزا دے سکتی ہے۔ عدالت کو یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ گناہ کے اثبات کیلئے گواہوں کی تعداد اور اہلیت کے متعلق بھی فیصلہ کرے۔ ہائی کورٹ نے ایک مقدمے میں اس صول کی حسب ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے۔
قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ مقدمہ کے حالات و واقعات کے پیش نظر گواہوں کی تعداد اور اہلیت کے تعین کا اختیار عدالت کو حاصل ہے۔

(1992ء پاکستان کریمنل لاء جرنل ص1520)

سپریم کورٹ آف آزاد کشمیر نے قصاص اور زنا کے مقدمات میں عورت کی گواہی کے حوالے سے یہ اصول بیان کیا ہے کہ" قصاص اور نفاذ کے مقدمات میں بھی چار مرد گواہوں کی شہادت کے بعد مزید شہادت کیلئے عورت کی گواہی میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ (1979 PLD سپریم کورٹ آزاد کشمیر ص56)

1979ء میں جبراً زیادتی کے ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے کراچی

ہائیکورٹ نے صرف ایک مظلومہ عورت کے بیان کو کافی گردانا اور قرار دیا کہ زنا بالجبر کے مقدمے کے حالات و واقعات کے پیش نظر زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کے بیان پر ملزم کو سزا دی جاسکتی ہے۔

(1979PLD ء کراچی ص 147) اسی طرح وفاقی شرعی عدالت نے خود بھی بہت سے مقدمات میں عورتوں کی گواہی پر زنا بالجبر کے ملزمان کو سزائیں سنائی ہیں اور عورتوں کی گواہی کے حق کو تسلیم کیا ہے۔

متعلقہ مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے وفاقی شرعی عدالت نے قرار دیا کہ ''حدود وقصاص کی متعین سزاؤں میں اگرچہ بالعموم فقہاء مردوں کی عینی شہادت کو لازم سمجھتے ہیں لیکن حدود سے فروتر تعزیری سزاؤں میں عورتوں کی چشم دید شہادت اور شہادت بالقرائن کو بھی آئمہ سلف نے قابل قبول قرار دیا ہے۔

(1987 PLD ء وفاقی شرعی عدالت ص 113)

4- حدود آرڈیننس سے قبل PPC (تعزیرات پاکستان) کی دفعہ 497 میں لفظ ''زنا'' کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔ ''جو کوئی کسی عورت کے ساتھ مباشرت کرتا ہے اور اس کے بارے میں اس کو علم یا یقین ہے کہ وہ کسی اور کی بیوی ہے اور اس شخص کی اجازت یا مشاورت کے بغیر اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے نیز اس کا یہ فعل جبراً زیادتی کے زمرے میں بھی نہیں آتا تو تصور کیا جائے گا کہ اس نے زنا کے جرم کا ارتکاب کیا ہے اس پر اس کو پانچ سال قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی اس مقدمہ میں عورت کو بطور ترغیب دینے والی کے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔''

جب کہ حدود آرڈیننس نے زنا کی تعریف یوں کی ہے ''ایک مرد اور عورت جو جائز طور پر آپس میں شادی شدہ نہیں ہیں زنا کے مرتکب قرار پائیں گے اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی جبر کے رضامندی سے ناجائز تعلقات قائم کرتے ہیں اب

ان دونوں قوانین کا تقابلی جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ حدود آرڈیننس عورت کی عزت و عصمت کا زیادہ محافظ ہے۔

i- سابقہ قانون میں زنا کے مجرم کے خلاف صرف متاثرہ عورت کا شوہر ہی مقدمہ درج کرا سکتا تھا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں تھا جب کہ حدود آرڈیننس کے تحت کوئی بھی شہری مدعی بن سکتا ہے۔

ii- سابقہ قانون کی رو سے خاوند اور بیوی کی رضامندی کے ساتھ اگر کوئی شخص اس جرم زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے مجرم نہیں گردانا جا سکتا تھا لیکن حدود قوانین نے یہ استثنٰی ختم کر دیا۔

iii- سابقہ قانون میں کسی غیر شادی شدہ عورت، کنواری لڑکی، بیوہ یا مطلقہ سے کیا گیا فعل زنا تصور نہیں ہوتا تھا جب کہ حدود قوانین کی رو سے اپنی بیوی کے علاوہ کسی بھی شادی شدہ یا غیر شادی شدہ عورت سے زنا کو جرم تصور کیا گیا ہے۔

iv- سابقہ قانون میں مرد ہی کو زنا کا ملزم قرار دیا جا سکتا تھا اس جرم میں شریک خاتون کیلئے کوئی سزا مقرر نہ تھی۔ حدود قوانین نے یہ استثنٰی بھی ختم کر دیا ہے۔

v- سابقہ قانون میں زنا کا جرم قابل راضی نامہ تھا جب کہ حدود قوانین نے اس جرم کو نا قابل معافی جرم قرار دیا ہے۔

vi- سابقہ قانون میں زنا کے جرم میں پانچ سال قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی تھیں جبکہ حدود قوانین میں مجرم کو حد کی صورت میں سنگسار کے ذریعے سزائے موت یا سو کوڑے اور تعزیر کی صورت میں دس سال قید بامشقت یا کوڑوں اور جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے۔

vii- حدود قوانین شادی شدہ عورت یا مرد کیلئے زنا بالجبر کی سزا سنگسار کے ذریعے سزائے موت اور غیر شادی شدہ کیلئے سو کوڑے مقرر کی گئی ہے جب کہ

سابقہ قانون میں اس جرم کی سزا دس سال تک قید اور جرمانہ تھی۔ حدود قوانین میں یہ اہتمام بھی رکھا گیا ہے کہ تزکیہ الشہود (چار مردوں کی گواہی) کے معیار پر زنا بالجبر کا جرم ثابت نہ ہو سکے تو مقدمہ کے دیگر حالات و واقعات کی روشنی میں 4 سال سے 25 سال تک سزائے قید بھی دی جاسکتی ہے اور 30 کوڑے بھی مارے جائیں گے اور اگر اس جرم کا ارتکاب دو یا دو سے زیادہ افراد نے باہم مشورہ سے کیا ہو تو ایسے تمام افراد کو سزائے موت دی جاسکتی ہے۔

اگر آپ کو اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم سے نواز رکھا ہے تو آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حدود قوانین کے نفاذ و اطلاق کے طریقہ کار میں ترمیم و تبدیلی بجا لیکن ان کے خاتمہ کا مطالبہ کرنا اسلامی قوانین سے بغض و عناد کا واضح ثبوت نہیں تو اور کیا ہے جب کہ یہ قوانین تو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی بھی سالمیت کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

حصہ دوم

جدید تمدنی مسائل اور ان کا شرعی حل

۱۔ پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت
۲۔ خاندانی منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت
۳۔ انسانی اعضاء کی پیوندکاری اور اس کا شرعی تجزیہ
۴۔ بیمہ (Insurance) کی شرعی حیثیت
۵۔ رہن (Mortgage) کے مسئلے کا اسلامی حل
۶۔ رویت ہلال (Moon sighting) کا فقہی تجزیہ

پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت

پوسٹ مارٹم یہ ایک عمل جراحی ہے جس کی غرض وغایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ مرنے والے شخص کی موت کے اسباب معلوم کیے جائیں۔ یہ عمل اس اعتبار سے جائز ٹھہرتا ہے کہ کسی کی موت کا اصل سبب معلوم کیا جائے تا کہ بے گناہ آدمی خواہ مخواہ موجب سزا نہ ٹھہرایا جاسکے۔

تاہم اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ کسی انسان کے قتل وغیرہ کے اسباب کا کھوج لگایا جائے تا کہ اصل مجرم کی شناخت ہو سکے اور دوسرا یہ ہے کہ میڈیکل کے طالبعلموں کو مختلف امراض کے اثرات سے آگاہ کرنا۔ یہ دونوں پہلو کچھ شرائط کے ساتھ اسلام میں قانون ضرورت (Law of necessity) کے تحت جائز ہیں۔ تاہم کچھ علمائے کرام نے پوسٹ مارٹم کو مطلقاً ناجائز اور حرام قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس سے میت کی بے حرمتی ہوتی ہے جو کسی طور پر جائز نہیں ہے لیکن جس طرح کسی عمل کے جواز وثبوت کیلئے دلیل شرعی مطلوب ہوتی ہے اسی طرح کسی حکم کے عدم جواز کیلئے شریعت سے کسی نص یا شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ میں پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت پر اپنا تجزیہ پیش کروں پہلے اس کے جواز اور عدم جواز کے دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

پوسٹ مارٹم کے عدم جواز کے دلائل

سب سے پہلے ان علمائے کرام کی آراء ملاحظہ فرمائیں جو میت کی بے حرمتی کے پیش نظر پوسٹ مارٹم کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس عمل سے بہت سی قانونی اور اخلاقی پیچیدگیوں کے پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔

۱۔ منہاج القرآن یونیورسٹی لاہور کے فقہ کے استاد مفتی عبد القیوم خان صاحب لکھتے ہیں۔

ہمارے نزدیک پوسٹ مارٹم کرنا، مردے کا مثلہ کرنے کے مترادف ہے۔ مسلمان جس طرح زندگی میں قابل احترام ہے اس طرح مرنے کے بعد بھی قابل احترام ہے۔ مسلمان تو مسلمان ہم کافر کو بھی (جہاد میں) قتل تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی موت کے بعد اس کے جسم کو چیڑ پھاڑ نہیں سکتے۔ جب کافر کی میت کو چیر پھاڑ نہیں سکتے تو پھر مسلمان کی میت کو ڈاکٹری تجربات کیلئے کھیل بنانا اور اس کی بے حرمتی کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔ [1]

۲۔ میت کی چیر پھاڑ کرنا حکم قرآنی کی خلاف ورزی ہے کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ (شیطان نے اللہ پاک کے سامنے اعلان کیا تھا)

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ [2]

اور ضرور انہیں حکم دوں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں کو بدلیں گے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے جسم انسانی کی چیر پھاڑ کرنا منع ہے اس سے بلا وجہ میت کی توہین و تذلیل ہوتی ہے۔

۳۔ مردے کے جسم کو تکلیف دینے کی ممانعت احادیث مبارکہ میں بھی آئی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا **کسر عظم المیت ککسرہ حیا** یعنی میت کی ہڈی توڑنا (اس کی تکلیف اور گناہ ہونے میں) ایسے ہی منع ہے جیسے زندگی میں توڑنا منع ہے۔ [3]

اسی طرح عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ''**رانی النبی** ﷺ **متکئا علی قبر فقال لا توذ صاحب ھذا القبر او لاتوذہٗ**

ترجمہ: رسول پاک ﷺ نے مجھے ایک قبر پر ٹیک لگائے دیکھا تو فرمایا اس قبر

والے کو تکلیف مت دو یا یہ فرمایا اسے تکلیف نہ دو۔ ۴

ان احادیث مبارکہ سے ثابت ہوا کہ مرنے والا بھی جسمانی تکلیف محسوس کرتا ہے لہٰذا پوسٹ مارٹم ناجائز ہوا۔

۴۔ بے مقصد تفریح کی خاطر مردہ انسانی جسموں سے کھیلنا اور ان کا چیرنا پھاڑنا اسلام اس عمل سے منع کرتا ہے۔ ۵

۵۔ مولانا ابو اعلیٰ مودودی لکھتے ہیں

ہمارے ہاں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ میں نے جہاں تک تاریخ کا مطالعہ کیا ہے مجھے ایسی کوئی روایت دکھائی نہیں دی۔ طب میں مسلمانوں نے بہت کام کیا ہے بڑی مفید خدمات انجام دی ہیں۔ طبی تحقیقات میں ان کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے لیکن انہوں نے اپنے کام یا اپنی تحقیقات کیلئے لاشوں کو چیرا پھاڑا نہیں ہے۔ خود یورپ میں اس چیز کو پسند نہیں کیا جاتا اور گزشتہ صدی تک یہ حالت تھی کہ لاشوں کو چرا کر ہی یہ کام ہوسکتا تھا چنانچہ لاشیں چرانے والوں کے گروہ بن گئے تھے جو ان طبی تحقیقات میں مدد دیتے تھے۔ دوسرے مقام پر مولانا لکھتے ہیں

کہ یہ کام طب اور سائنس کے نام پر کیا جائے یا پوسٹ مارٹم کی خانہ پری کیلئے سرانجام دیا جائے آپ دیکھیں گے کہ صرف غریبوں کی لاشیں ہی ان مقاصد کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔ آخر صدر کینیڈی بھی گول کا نشانہ بنے اور گاندھی جی بھی۔ کیا اس کیلئے ان کی چیر پھاڑ ہوئی؟ معلوم یہ ہوا کہ یہ طب کی ترقی اور قانون کی وہ ضرورت ہے جو صرف غریبوں اور لاوارثوں کی لاشوں سے ہی پوری ہوسکتی ہے۔ ۶

۶۔ ممتاز شیعہ عالم شیخ آیت اللہ خوئی پوسٹ مارٹم کے بارے میں لکھتے ہیں

مسلمان میت کا پوسٹ مارٹم کرنا جائز نہیں اور اگر پوسٹ مارٹم کیا جائے تو دیت کے احکام کے مطابق پوسٹ مارٹم کرنے والے پر دیت ادا کرنا واجب ہے۔

پوسٹ مارٹم کے جواز کے دلائل

وہ علمائے کرام جن کے نزدیک تحقیق واقعہ، انکشاف جرم اور تحصیل علم کیلئے پوسٹ مارٹم کرنا جائز ہے ذیل میں ان کے دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ مفسر قرآن، شارح مسلم علامہ غلام رسول سعیدی پوسٹ مارٹم کے بارے میں اپنی رائے یوں لکھتے ہیں

''ایسی صورت میں جب کہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔ [۶]

۲۔ مصری علماء نے منفعت عامہ کے پیش نظر پوسٹ مارٹم کو جائز قرار دیا ہے اس سلسلہ میں مصری دارالافتاء سے ۳۱/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ایک فتویٰ نمبر ۲۳۹ جاری ہوا جس میں میت کے پوسٹ مارٹم کو جائز قرار دیا گیا اور جواز کی وجہ منفعت عامہ قرار دی گئی۔ فتویٰ میں کہا گیا کہ چونکہ دین اسلام کی بنیادیں انسانی منفعت کے اصول پر قائم ہیں اس لیے منفعت عامہ کے تقاضے کے پیش نظر پوسٹ مارٹم جائز ہے۔ نیز یہ کہ فقہ اسلامی کا اصول ہے کہ جہاں دو ضرر رساں امر موجود ہوں اور ایک سے بچنے کیلئے دوسرے کو اختیار کیئے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو کم ضرر رساں امر کو زیادہ ضرر رساں امر سے بچنے کیلئے اختیار کیا جاسکتا ہے جبکہ اس میں مصلحت عامہ بھی ہو۔

اس فتویٰ میں مصلحت عامہ کی دو صورتیں پیش نظر رکھی گئی ہیں۔

(i) ایک تو یہ کہ پوسٹ مارٹم سے قاتل پر قتل کے الزام کی تحقیق مقصود ہو اور اس سے تہمت کی صداقت یا قاتل کی برأت کا فیصلہ کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔

(ii) دوسرا یہ کہ پوسٹ مارٹم سے متوفی کی موت (ناگہانی موت) کا سبب معلوم ہو

سکتا ہو اور اگر موت زہر خورانی سے واقع ہوئی تو زہر کی قسم معلوم کی جا سکتی ہو۔ رہا طب و جراحت کی تعلیم کیلئے پوسٹ مارٹم کرنے کا مسئلہ تو یہ مصلحت دارالافتاء کے اراکین کی نظر میں پہلی دونوں مصلحتوں سے زیادہ اہم اور مفید ہے۔ ۷

۳۔ ڈاکٹر احمد شریف الدین نے بھی پوسٹ مارٹم مباح کرنے والے بعض احکامات کا تذکرہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امت پر حصول علم واجب قرار دیا ہے اور علم طب و جراحت بھی علم کا ایک شعبہ ہے جس میں آپریشن اور پوسٹ مارٹم بھی شامل ہے کیونکہ اس کے بغیر علم طب کی تعلیم غیر مکمل رہتی ہے لہٰذا علم طب کا حصول واجب کے زمرے میں آنے کی وجہ سے آپریشن اور پوسٹ مارٹم کا علم بھی نہ صرف مباح بلکہ واجب ہوگا۔ ۸

پوسٹ مارٹم کرنے کی چند شرائط

پوسٹ مارٹم کے جواز کو ثابت کرنے والے علماء ڈاکٹر شرف صاحب سمیت جواز کے قائل ہونے کے باوجود چند کڑی شرائط بیان کرتے ہیں جن کے بغیر وہ بھی پوسٹ مارٹم کی اجازت نہیں دیتے۔

۱۔ جس جسم کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہو اس کے مردہ ہونے کی تحقیق ہو چکی ہو کہ واقعی مردہ ہے۔

۲۔ میت کے مرنے سے قبل اس سے اس پوسٹ مارٹم کی اجازت حاصل کی گئی ہو تاہم اگر پوسٹ مارٹم تعلیم و تربیت وغیرہ کیلئے ہے اور میت سے اس کی زندگی میں اجازت حاصل نہ ہو سکی تو اب اس کے ورثاء سے اجازت لینا ہوگی لیکن اگر پوسٹ مارٹم کسی قانونی موشگافی کے ازالے اور عدالتی تحقیقات کی غرض

سے ہے تو پھر ورثاء کی اجازت کی ضرورت نہیں صرف عدالت کا حکم کافی ہے۔

۳۔ لاوارث لاشوں کا پوسٹ مارٹم تعلیم وتربیت کی غرض سے جائز ہوگا کیونکہ اس میں ورثاء کی عدم دستیابی کا عذر موجود ہے اور ضرورت شرعی بھی موجود ہے۔

۴۔ ورثاء سے اجازت لیتے وقت انکی مادی ضرورت کو پورا کرنا بھی پیش نظر رہے۔

۵۔ پوسٹ مارٹم کی واقعی شرعی ضرورت بھی ہو مثلاً طب و جراحت کا علم سکھانے کیلئے یا عدل وانصاف کے قیام میں مدد کیلئے یا تشخیص امراض کیلئے۔

۶۔ جسم کی عزت وتکریم کا لحاظ رکھا جائے یعنی جس حصہ کا پوسٹ مارٹم مطلوب نہ ہو اس کی قطع و برید نہ کی جائے۔

۷۔ میت کے جو حصے بچ جائیں انہیں بڑی احتیاط کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔

راقم الحروف کا تجزیہ

راقم الحروف اگرچہ اس فن کا طالبعلم نہیں ہے تاہم جدید مسائل کے شرعی و قانونی اور اسلامی حل کی ایک جستجو ہمیشہ ایسے مسائل کے مطالعہ کی طرف راغب رکھتی رہی ہے۔

جہاں پوسٹ مارٹم کے مسئلے کا تعلق ہے تو بڑے عرصے سے اس مسئلہ کے شرعی و قانونی پہلوؤں سے آگاہی کی طلب اپنے اندر محسوس کر رہا تھا اس مقالے کی تیاری میں ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب کے مقالہ سے خصوصی معاونت کے علاوہ کچھ اور کتب ورسائل سے راہنمائی حاصل کرنے کے بعد میں نے اس کے جواز وعدم جواز کے دلائل اپنے قارئین کیلئے جمع کر دیئے ہیں تاکہ وہ ان دلائل کی روشنی میں نفس مسئلہ کے بارے میں کامل آگاہی حاصل کرسکیں۔ ان متذکرہ بالا دلائل کی روشنی میں راقم الحروف ایک طفل مکتب کی حیثیت سے جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کا عمومی مزاج ہی اس طرح ہے کہ اس میں فرد واحد کی بجائے معاشرے کے

مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ معاشرہ ہمیشہ فرد سے ہی تشکیل پاتا ہے لہذا فرد کے مفاد کو بھی ہمیشہ اسلام نے پیش نظر رکھا ہے لیکن انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو مقدم رکھا ہے۔

میں قانون کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لیتا ہوں تو میری فکر اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ عدالت میں کسی شخص پر جرم ثابت کرنے یا اسے جرم سے بری قرار دینے کیلئے پوسٹ مارٹم اور آپریشن رپورٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ کسی ماہر ڈاکٹر کی رپورٹ کے بغیر اسباب قتل یا موت کا سراغ لگانا ایک مشکل کام ہو جاتا ہے لہذا بے گناہ کو سزا سے بچانا اور اصل مجرم کو بے نقاب کرنے کیلئے بھی پوسٹ مارٹم کے جواز کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ بعض امراض کی صحیح تشخیص اور علاج جدید آپریشن سسٹم کے بغیر مشکل ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے لہذا ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے پیش نظر ضرورت شدیدہ کے وقت آپریشن اور پوسٹ مارٹم وغیرہ کی شرعی اجازت ہونی چاہیے جہاں تک توہین میت کے مسئلے کا تعلق ہے تو اگر آغاز میں ہی یہ طے کر لیا جائے کہ یہ پوسٹ مارٹم شرعی ضرورت کے پیش نظر کیا جا رہا ہے تو پھر اس میں میت کی توہین کا پہلو ختم ہو جاتا ہے کیونکہ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''کہ اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم'' تو صحابہ کرام نے از راہ تعجب پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی مدد کرنا سمجھ میں نہیں آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ظالم کو ظلم سے روک دینا بھی اس کی مدد ہے۔'' اس حدیث مبارکہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ شرعی مصالح کے پیش پوسٹ مارٹم اہانت نہیں اعانت کے زمرے میں آئے گا اور پوسٹ مارٹم کو مثلہ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ مثلہ عموماً دشمنی اور عداوت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے کوئی شخص کسی کی تعظیم و

توقیر یا ادب واحترام میں اس کا مثلہ نہیں کرتا لہٰذا پوسٹ مارٹم کی کاروائی کو مثلہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور جن احادیث مبارکہ میں مردہ کی ہڈیاں توڑنے سے منع کیا گیا ہے وہاں ہڈیاں توڑنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ ہڈیاں توڑنے والے کا مقصد کسی منفعت کا حصول یا شرعی مقصد کی تحصیل یا علم کا حصول ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ شخص اسی طرح ہڈیاں توڑ رہا ہوگا جس طرح عمومی طور پر لوگ بیٹھ کر درخت کے پتے یا پھول مسلتے رہتے ہیں چنانچہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اس لایعنی عمل سے منع فرمادیا ہوگا۔

تاہم میرا میت کے پوسٹ مارٹم کے جواز کی طرف مائل ہونے سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ اس طرح میڈیکل کے طلباء وطالبات میت کے اعضاء سے کھیلتے رہیں یا میت کے اعضاء سے ہنسی مزاح اور دل لگی کی کیفیت پیدا کرلیں کیونکہ اس طرح شرعی مصلحت مفقود ہونے کے ساتھ ساتھ میت کی توہین لازم آئے گی جو کسی طور پر بھی جائز نہیں ہے۔

پوسٹ مارٹم کے جواز کی رائے کیلئے ایک طرف متذکرہ بالا شرائط کی سختی سے پابندی کی جائے تو دوسری طرف شرعی وقانونی ضرورت کے حصول کے بغیر میت کی تذلیل وتوہین کرنے والوں کیلئے قرار واقعی سزا کی قانون سازی کی جائے۔

میڈیکل کے طلباء وطالبات جو تحصیل علم کیلئے میت کے اعضاء کی قطع وبرید کرتے ہیں تو ان کے لیے بھی ایک زبردست ضابطۂ اخلاق وضع کیا جائے تاکہ ایک طرف وہ علم کے حصول کی آڑ میں توہین میت کے مرتکب نہ ہوں تو دوسری طرف انہیں یہ باور کردیا جائے کہ کل کو ان کی میت بھی آلات جراحی کی زد میں آسکتی ہے۔ میرے نزدیک اگر اس انداز سے قانون سازی کی جائے تو شرعی مصلحت کا حصول بھی ممکن ہو سکتا ہے اور اخلاقی قباحتوں کا ازالہ بھی ہوسکتا ہے۔

هذا ما عندی واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مصادر و مراجع

۱۔ منہاج القرآن نومبر ۱۹۹۴

۲۔ قرآن پاک۔ سورۃ النساء۔ آیت نمبر ۱۱۹

۳۔ ابوداؤد، ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ ۱۴۹

۴۔ مشکوٰۃ ۱۴۹

۵۔ اسلامی طرز فکر از عادل صلاحی

۶۔ شرح صحیح مسلم جلد دوم ص ۸۲۷

۷۔ پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت ص ۱۳ از ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

۸۔ احکام الشرعیہ لاعمال الطبیہ

خاندانی منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت

مغرب میں جب سے آزادی کی تحریکوں کا آغاز ہوا ہے ہر چیز کو عقلی فکر کے پیمانوں سے ماپا جانے لگا ہے۔ بھلا ہر چیز مادی ترازو میں ہی تولی جائے تو پھر اس کی صداقت اور قطعیت کی گواہی کیسے دی جاسکتی ہے؟ کیونکہ اکتسابی علم خواہ کتنا ہی وسیع اور گہرا کیوں نہ ہو بہر حال وہ جزوی مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے جس میں نئے مشاہدات کا اضافہ پرانے اخذ کردہ نتائج کو جھٹلاتا ہے جس سے علم کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مغرب میں جو نظریہ یا تھیوری ایک وقت میں بڑی شد و مد سے پیش کیا گیا بلکہ اسے حتمی ڈاکٹرائن سمجھا گیا کچھ ہی عرصہ بعد اس نظریہ کو جھوٹا قرار دے کر ایک نئی تھیوری کی بنیاد رکھ دی گئی۔ مغرب کی علمی و سائنسی تاریخ ایسے ہی مفروضات پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے مغربی دانش کا رشتہ ہمیشہ وحی الٰہی سے منقطع ہی رہا ہے۔ جس چیز کو وہ وحی سمجھتے رہے وہ وحی نہیں تھی اور جو اصلی وحی تھی اس میں اس قدر تحریفات ہو چکی تھیں کہ وہ انسانی اور الہامی افکار کا مغلوبہ بن چکی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی فکر الہامی ہدایت کے دوائر سے باہر ہی رہی اور کفر و ایمان کی سیڑھیاں چڑھتی اترتی رہی۔

جہاں تک خاندانی منصوبہ بندی کا تعلق ہے یہ بھی یہودی ذہن کی اختراع ہے۔ مغربی مفکروں کا خیال ہے کہ ہر روز لاکھوں بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو نہ صرف وسائل حیات کم پڑ جائیں گے بلکہ یہ زمین بھی بوجھل ہو جائے گی اور بالآخر ایک دن آبادی کا بم یوں پھٹے گا کہ یہ دنیا تباہی سے دوچار ہو جائے گی۔ اس تصور کے عدم جواز اور جواز کا جائزہ لینے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ خاندانی منصوبہ

بندی سے مراد کیا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کیا ہے؟

خاندانی منصوبہ بندی یا فیملی پلاننگ سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی میں مصنوعی اور غیر فطری طریقے اختیار کر کے شرح پیدائش کو روکا جائے تا کہ خوشحال زندگی ممکن ہو سکے۔ ''کم بچے خوشحال گھرانہ'' کا نعرہ اسی تصور پر مبنی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے

بچوں کی پیدائش کو روکنے کیلئے جو مصنوعی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں چند ایک درج ذیل ہیں۔

1- عورت کے رحم میں لوپ (Loop) یعنی چھلہ نما ایسی چیز رکھنا ہے جس کی وجہ سے مادہ منویہ رحم میں استقرار نہ پکڑ سکے۔

2- گولیوں وغیرہ سے حمل گرا دینا۔

3- کیمیکل طریقے اختیار کرنا جن میں کریم وغیرہ کا استعمال بھی ہوتا ہے۔

4- کنڈوم یعنی ساتھی وغیرہ کا استعمال کر کے حمل کو روکنا۔

5- ٹیکوں وغیرہ سے حمل گرا دینا یا ٹھہرنے ہی نہ دینا جیسے سبز ستارے والا ٹیکہ۔

6- مرد و عورت کی نس بندی کرنا یعنی بچے پیدا کرنے کی صلاحیت کو عملاً ختم کر دینا۔

7- عزل کرنا

عزل کیا ہے؟

عزل یہ ہے کہ اگر مزید بچہ پیدا کرنے کی خواہش نہ ہو تو بیوی سے صحبت کرتے ہوئے انزال کے وقت بیوی سے علیحدہ ہو جانا تا کہ مرد کا سپرم (Sprcm) عورت کے اووم (Ovum) سے مل نہ سکے۔

عزل کے جواز کے دلائل

جن احادیث کی بنیاد پر فقہاء نے عزل کی اجازت دی ہے ان میں سے دو احادیث پیش کرر ہا ہوں تا کہ مسئلہ واضح ہو سکے۔

1- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

''کنا نعزل علی عھد النبی ﷺ والقرآن ینزل'' [1]

ترجمہ: ''ہم نبی کریم ﷺ کے دور میں عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا'' اور قرآن کے نازل ہونے کا معنی یہ ہے کہ اگر عزل ناجائز ہوتا تو وحی کی صورت میں اس کی ممانعت نازل ہو جاتی چونکہ عزل کی ممانعت یا حرمت نازل نہیں ہوئی اس لیے یہ جائز ہے۔

2- دوسری حدیث امام ترمذی نے اپنی صحیح میں باب النکاح میں نقل کی ہے۔ یہ حدیث بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

''عن جابر قلنا یارسول اللہ ﷺ انا کنا نعزل فزعمت الیھود انه الموؤدة الصغری فقال کذبت الیھود ان اللہ اذا اراد ان یخلقه لم یمنعهٗ'' [2]

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم عزل کرتے تھے تو یہودیوں نے کہا یہ زندہ در گور کر دینے کی چھوٹی قسم ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہودیوں نے جھوٹ کہا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کوئی چیز اس کو روک نہیں سکتی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہود کے قول کو ردّ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے عزل کی اجازت عنایت فرمائی ہے۔ ان احادیث سے بعض لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے جواز کی سند اخذ کرتے ہیں جب کہ بعض عزل کو تو جائز سمجھتے

ہیں مگر خاندانی منصوبہ بندی کے مروجہ طریقوں کو خلاف شرع گردانتے ہیں۔ اس بحث کو نتیجہ خیز صورتحال تک پہنچانے سے قبل دونوں طبقہ ہائے فکر کے دلائل اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ ان کی روشنی میں بات کو آگے بڑھایا جا سکے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے جواز کے دلائل

جو لوگ خاندانی منصوبہ بندی یا فیملی پلاننگ کو جائز سمجھتے ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں۔

1- نبی کریم ﷺ نے چونکہ عزل کی اجازت دی تھی اس لیے برتھ کنٹرول کے مروجہ طریقے جن میں ادویات کا استعمال، آپریشن اور کنڈوم کا استعمال شامل ہیں یہ سب جائز ہیں اور یہ عزل میں ہی شمار ہوں گے۔

2- حمل ٹھہرنے نہ دیا جائے یا جلد گرا دیا جائے تو یہ انسانی قتل کے زمرے میں نہیں آتا کیونکہ وہ ایک نطفہ ہی تو ہوتا ہے۔

3- چھوٹا خاندان ہونے کی وجہ سے معاشی ناہمواریوں سے نجات مل جاتی ہے اور ایک انسان اپنے کنبے سمیت پرسکون زندگی گزار سکتا ہے۔

4- علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ اگر کثرت تعداد کی ضرورت نہ ہو تو عزل یا کسی بھی طریقے سے حمل روکا جا سکتا ہے۔ [۳۲]

خاندانی منصوبہ بندی کے عدم جواز کے دلائل

جن علماء کے نزدیک خاندانی منصوبہ بندی جائز نہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں۔

1- اس نیت سے فیملی پلاننگ کرنا کہ پیدا ہونے والے بچے رزق کی کمی کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے شرعاً ناجائز ہے کیونکہ ہر چیز کے رزق کی ذمہ

داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے''زمین پر چلنے والی ہر (ذی روح) چیز کا رزق ہمارے ذمے ہے'' لہٰذا حمل ٹھہرنے نہ دینا یا حمل گرا دینا اللہ تعالیٰ کی شان رزاقی کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

2- یہودی مفکروں نے زیادہ بچوں کے خوف سے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے تو گھڑ لیے ہیں لیکن انہوں نے اپنے زرخیز دماغوں کو استعمال کر کے یہ نہیں سوچا کہ آسٹریلیا کا آدھا براعظم بے آباد پڑا ہے۔شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظم بہت کم آبادی رکھتے ہیں بلکہ پاکستان کا صرف ایک چوتھائی رقبہ زیرِ کاشت ہے اور اس کے آبی وسائل میں سے تین چوتھائی فضول سمندر میں گر رہے ہیں۔ بھلا ان وسائل کو استعمال میں لا کر دنیا کے غیر آباد خطوں کو آباد کیوں نہیں کیا جاتا۔

3- نبی کریم ﷺ کے والد گرامی اپنے ماں باپ کے بارہویں بیٹے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد کے گیارہویں بچے تھے۔ اندازہ فرمائیں کہ فطرت کے اصول کتنے نرالے ہیں کہ ان دو خاندانوں کے نو یا دس بچے معمولی زندگی گزارتے ہیں لیکن گیارہواں اور بارہواں بچہ انسانیت کی نئی تاریخ رقم کرتا ہے اور تہذیب و تمدن کا بانی قرار پاتا ہے بلکہ روس کا مایہ ناز کیمیا دان مینڈلیو اپنے والدین کا چودھواں بچہ تھا۔

4- یہ تصور ہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ زیادہ بچے ہوں گے تو ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام صحیح نہیں ہو سکے گا۔بعض خاندان ایسے ہیں جو امیر بھی ہوتے ہیں اور ان کے ایک یا دو بچے ہوتے ہیں لیکن بالکل نکھٹو اور جاہل ہوتے ہیں جبکہ بعض خاندانوں کے گیارہ گیارہ بچے ہوتے ہیں لیکن وہ انتہائی سنجیدہ،

پڑھے لکھے اور باروزگار ہوتے ہیں۔

5- فیملی پلاننگ کے فضائل وفوائد بیان کرنے والے اسکالرز یہ بھول جاتے ہیں کہ جن امریکی اور یورپی دانشوروں کی فکری تحریک کی آڑ میں وہ دنیا سے آبادی کا بوجھ کم کرنے میں مصروف کار ہیں۔ان کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ وہ انسانوں سے زیادہ کتوں اور بلیوں سے پیار کرتے ہیں۔اس لیے صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر سال پالتو جانوروں کی خوراک پر دو ارب ڈالرخرچ کیے جاتے ہیں اگر یہ رقم وسائل زندگی پیدا کرنے میں صرف کی جائے تو کیا دنیا امن کا گہوارہ نہیں بن سکتی۔

6- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے قیامت کے دن دوسری امتوں پر فخر کروں گا خواہ یہ کثرت ناکمل بچہ کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔'' ؎

لہٰذا ثابت ہوا کہ فیملی پلاننگ کی ترغیب دلانا اشتہار بازی کرنا اور بلا ضرورت اور مختلف طریقوں سے مانع حمل ادویات استعمال کرنا جہاں اسلام کی روح کے خلاف ہے وہاں تولید کے فطرتی تقاضوں کے بھی خلاف ہے اس لیے خاندانی منصوبہ بندی خلاف شرع ہونے کے ساتھ ساتھ خلاف فطرت بھی ہے لیکن ضرورت اور حاجت کے وقت حمل کا گرانا یا ضائع کرنا ایک بالکل دوسری بات ہے۔

اسقاطِ حمل

خاندانی منصوبہ بندی کی ایک صورت یہ ہے کہ رحم مادر میں حمل ٹھہرنے کے بعد ادویات یا انجکشن کے ذریعے ختم کروادینا یا ویسے رحم کی صفائی کروادینا تا کہ بچہ پیدا نہ ہو سکے۔اب اس مسئلے کا شرعی حل جاننے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ جب مرد عورت کے تولیدی جرثومے (Creative cell) آپس میں ملتے ہیں جن سے رحم

میں استقرار حمل ہوتا ہے تو اس کے بعد بچہ جننے تک قرآن مجید کی رو سے اس کے سات مراحل ہوتے ہیں جن کو آج میڈیکل سائنس بھی درست مانتی ہے اور وہ یہ ہیں

۱۔ سلالہ ۲۔ نطفہ ۳۔ علقہ ۴۔ مضغہ

۵۔ عظام ۶۔ لحم (گوشت) ۷۔ مکمل انسانی ڈھانچہ

ان سات مراحل کی تکمیل کے بعد اس ڈھانچے کے اندر روح پھونکی جاتی ہے جس کے بعد بقیہ بڑھوتری کا عمل شروع ہوتا ہے اور بالآخر 270 ایام یعنی 9 ماہ کے بعد ایک انسانی بچے کی ولادت ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا حمل کو ضائع کرنا بچے یا بچی کے قتل کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟

فقہاء نے اس ضمن میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے کہ اگر حمل چار ماہ سے قبل گرا دیا جائے تو وہ چونکہ انسانی بچہ یا بچی نہیں بلکہ جان پڑنے سے قبل محض ایک نطفہ ہی ہوتا ہے اس لیے اس کا شدید ضرورت پر گرانا قتل اولاد کے زمرے میں نہیں آئے گا جیسا کہ عزل کی صورت میں پانی کے گرا دینے کو قتل شمار نہیں کیا جاتا۔ ہاں البتہ چار ماہ کے بعد جب اس میں جان پڑ جاتی ہے اس وقت اس کو ضائع کرنا یا حمل کا گرانا بلاشبہ انسانی قتل کے زمرے میں آئے گا اس کی بنیاد وہ حدیث نبوی ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ

''حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ﷺ نے فرمایا تمہارا نطفہ ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو جما ہوا خون بنا دیتے ہیں۔ پھر چالیس دن بعد اللہ تعالیٰ اس کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیتے ہیں پھر چالیس دن بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اس کو حکم دیتا ہے کہ اس کا عمل اس کا رزق اس کی موت اس کا شقی یا سعید ہونا لکھ دو پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔'' [5]

لہٰذا چار ماہ سے قبل عند الضرورت مجبوری کی بنا پر حمل کا گرانا جائز ہوگا لیکن چار ماہ بعد بلا ضرورت شرعی حمل کا گرانا انسانی بچے کا قتل ہی شمار ہوگا اور فقہاء نے اس سلسلہ میں بڑا سخت فتویٰ دیا ہے کہ اگر اسقاط حمل سے قبل بچہ زندہ ہو اور حمل گرا دیا جائے تو جرم کرنے والے پر دیت (خون بہا) واجب ہوگی اور اگر بچہ مردہ ہو اور اسقاط کرا دیا جائے تو کم از کم عقوبت مالیہ اور جرمانہ یا تاوان تو ضرور ہوگا لیکن یہ بات واضح رہے کہ اگر میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ سے یہ امر یقینی طور پر ثابت ہو جائے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں زندہ یا مردہ ایسی حالت میں ہے جس میں عورت کی زندگی کو خطرہ ہے تو پھر فقہی قاعدہ کی رو سے بڑے نقصان سے بچنے کیلئے چھوٹا نقصان قبول کر لیا جائے گا تا کہ عورت کی زندگی کا چراغ گل نہ ہو سکے کیونکہ ماں اصل ہے اور بچہ اس کی فرع ہے اصل کی بقا کیلئے فرع کا ضیاع جائز ہوگا۔

راقم الحروف کا تجزیہ

میرے نزدیک خاندانی منصوبہ بندی دراصل میاں اور بیوی کا پرائیویٹ مسئلہ ہے۔ اگر مرد اور عورت خود آپس میں طے کر لیں کہ وہ زیادہ بچوں کی صحیح دینی، اخلاقی اور روحانی تعلیم و تربیت نہیں کر سکیں گے یا مزید بچے کی پیدائش سے عورت کی صحت بگڑنے کا احتمال ہو یا کسی بیماری کی وجہ سے از خود پیدا ہونے والے بچے کے معذور پیدا ہونے کا خدشہ ہو تو میاں بیوی مانع حمل ذرائع جیسے عزل وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن حکومتی سطح پر لاکھوں، کروڑوں روپے خرچ کر کے خاندانی منصوبہ بندی کے نت نئے طریقے متعارف کروانا اور باقاعدہ ایک محکمہ کی صورت میں مختلف ادویات استعمال کر کے شعوری طور پر بچے پیدا کرنے کی صلاحیت ختم کرنا بالکل ایک قبیح فعل ہے۔

مسلمانوں کیلئے مغرب کی اندھی تقلید میں خاندانی منصوبہ بندی کو قبول کرنا اور اس کی تشہیر پر کروڑوں روپے خرچ کرنا قطعاً درست نہیں کیونکہ مسلم معاشرے کی اپنی

اخلاقی اور روحانی اقدار ہوتی ہیں جن کو مٹانا اسلام کے نظام حیات کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ پاکستان میں غیر ملکی فنڈنگ پر پلنے والی این جی اوز شور مچاتی رہتی ہیں کہ اس ملک میں گنجائش سے زیادہ افراد ہوتے جارہے ہیں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں شرح آبادی بہت سے ملکوں سے کم ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں آبادی کی شرح 196 افراد فی مربع کلومیٹر ہے جب کہ اسرائیل کی آبادی 291 افراد فی مربع کلومیٹر ہے لیکن اس کے باوجود اسرائیل کی حکومت شرح پیدائش میں اضافہ اور دوسرے یہودیوں کو اسرائیل میں بسانے کیلئے اقدامات کر رہی ہے اور ہم ہیں کہ آبادی میں اضافہ کے خوف سے ہلکان ہوئے جارہے ہیں۔ بیشتر ممالک ایسے ہیں جو آبادی میں اضافے کے حامی ہیں تاکہ نیا خون شامل ہوتا رہے اور پیداوار میں اضافہ ممکن ہو سکے۔ کچھ عرصہ قبل سنگاپور کی خبر تھی کہ وہاں حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو عورتیں مائیں بنیں گی انہیں خصوصی مراعات دی جائیں گی۔ لیکن ہمارے ارباب بست و کشاد نہ جانے یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ جو بچہ دنیا میں آرہا ہے وہ خالی ایک منہ یا پیٹ نہیں بلکہ اپنے ساتھ دو ہاتھ دو پاؤں بلکہ ایک تر و تازہ دماغ بھی لیکر آرہا ہے۔ آپ اس بچے کے دنیا میں آنے سے روکنے کے ذرائع اختیار کرنے کی بجائے اس کیلئے بہتر زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیوں نہیں کرتے؟

دراصل یہ سارے گورکھ دھندے تہذیب مغرب کی پیداوار ہیں۔ مغربی اور امریکی معاشروں کے متکبرانہ رویوں کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ ایک امریکی خاتون کہنے لگی کہ امریکہ ساری دنیا کو رزق فراہم کرنے والا ملک بن چکا ہے بھلا دیگر ممالک اپنے اناج خود کیوں نہیں پیدا کرتے اس پر ایک شخص نے سوال کیا بی بی جب امریکہ نہیں تھا تو دنیا کو رزق کون دیتا تھا یہ سن کر وہ عورت حواس باختہ ہوگئی۔

ہماری حکومتیں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے متعارف کروانے کیلئے جتنے

وسائل برباد کر رہی ہیں روزانہ مختلف ٹی وی چینلز پر لاکھوں کے اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔ کروڑوں کی ادویات تیار کی جاتی ہیں کیونکہ کچھ عرصہ قبل بیگم عطیہ عنایت اللہ نے اپنی وزارت کے دور میں کہا تھا کہ وہ ملک کی چالیس فیصد خواتین تک مانع حمل ادویات پہنچائیں گی۔ ان نابکاروں سے کوئی پوچھے کہ اتنے کروڑوں اربوں روپے کے وسائل کو آپ بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے ناخواندہ جوانوں کو تعلیم یافتہ بنانے، سائنس وٹیکنالوجی کو فروغ دینے اور غربت کے خاتمے کیلئے نئی انڈسٹریز اور کارخانوں کے قیام پر خرچ کیوں نہیں کرتے تاکہ بیروزگار جاہل اور منشیات کے عادی لوگ معاشرے کے کارآمد شہری بن سکیں۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان نے جب بھی اپنا رشتہ وحی الٰہی سے توڑا ہے نامرادی ہی اس کا مقدر ٹھہری ہے جو معاشرے ٹھوس اخلاقی بنیادوں پر قائم نہ ہوں وہ کچھ عرصہ بعد خود ہی اجڑ جایا کرتے ہیں۔ حالانکہ خاندانی منصوبہ بندی کا فروغ کوئی انسانیت کی خدمت نہیں بلکہ خود برائی کے ذرائع سستے کرنے اور جرائم پیشہ افراد کی راہیں کشادہ کرنے کے مترادف ہے۔ آپ خود غور فرمائیں کہ خاندانی منصوبہ بندی کے ذرائع متعارف ہونے سے قبل بدکاری کے عادی لوگ ڈرتے تھے کہ کہیں اس طرح استقرار حمل سے معاشرے میں وہ رسوا نہ ہو جائیں لیکن اب فیملی پلاننگ والوں نے ایسے دیوثوں کیلئے کام آسان کر دیا ہے بلکہ امریکہ کے ٹیلی ویژن چینلز پر یہ اشتہار کچھ عرصہ قبل تک بڑے تواتر کے ساتھ چلتا رہا ہے کہ مائیں اپنی بچیوں کو سکول بھیجنے سے قبل ان کے بستوں میں کنڈوم رکھنا نہ بھولیں۔ اندازہ فرمائیں مغربی تہذیب کس قدر ڈھٹائی کے ساتھ اپنی نسل نو کو فحاشی کے راستے پر ڈال رہی ہے اور ہمارے نام نہاد الیکٹرونک دانشور مغربی تہذیب کی اتباع میں فیملی پلاننگ کے فوائد بتاتے نہیں تھکتے۔

اس ننگ انسانیت تہذیب کے اخلاقی دیوالیہ پن کا ذکر کرتے ہوئے

دانائے راز علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
یہ حوریان فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشت مغربیان جلوہ ہائے پا برکاب
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے
چہرہ پر جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

مصادر و مراجع

۱۔ مسلم شریف
۲۔ امام ترمذی۔ باب النکاح
۳۔ زاد المعاد
۴۔ المعرفہ للبیہقی
۵۔ امام بخاری۔ جلد اوّل صفحہ 456

انتقالِ خون، گردہ کی تبدیلی اور آنکھ کا عطیہ

اعضاء کی پیوندکاری کی شرعی حیثیت

اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے۔ اس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ یہ قیامت تک کے مسائل اور ان کے حل کو اپنے دامن کرم میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہر دور کے نت نئے تقاضوں اور چیلنجز کا واضح، جامع اور معقول (Reasonable) حل الہامی ادیان میں سے صرف اسلام ہی پیش کرتا ہے۔

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

''کوئی خشک وتر چیز ایسی نہیں جس کا (واضح) حل قرآن مجید میں نہ ہو''

کی نوید جانفزا سنانے والا قرآن اور صحیح بخاری کتاب بدء الخلق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کے مطابق ''بدء الخلق'' یعنی ابتدائے تخلیق کائنات (Creation of univerce) سے لے کر یوم قیامت تک کے حالات وواقعات کی تفصیل بتانے والے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھلا بیسویں صدی کے آواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں رونما ہونے والے مسائل کی نشاندہی اور ان کا حل کیوں نہ پیش فرماتے۔

اگرچہ قرآن وحدیث میں بنیادی اصول اور قواعد وقوانین بیان کیے گئے ہیں لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابتدائے اسلام میں ہی ''معاذ ابن جبل والی حدیث'' کے مطابق اجتہاد کا دروازہ کھول کر علمائے امت کی یہ ذمہ داری لگا دی کہ وہ ہر دور میں جنم لینے مسائل کو سمجھیں اور انہیں قرآن وسنت کے پیمانے پر پرکھ کر انکا واضح اور مناسب حل پیش کریں۔ چنانچہ دورِ حاضر میں دہلیز اسلام پر اپنے حل کیلئے منتظر کھڑے مسائل میں سے اعضاء کی پیوندکاری، گردہ کی تبدیلی، آنکھ کا عطیہ اور انتقال

خون جیسے مسائل شامل ہیں۔ان کے جواز اور عدم جواز پر علماء کے مختلف نقطہ ہائے نظر (views) ہیں۔جن علماء نے ان کے جواز اور عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے ان کی علمیت اور حسن نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن انہیں دین کے مزاج اور ان کی حکمت کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔ہم زیر بحث مسائل میں سے اعضاء کی پیوند کاری کی شرعی حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

اعضاء کی پیوند کاری

اسلام میں کسی انسانی عضو کے ضائع یا بیکار ہو جانے کی صورت میں اس کی جگہ مصنوعی عضو لگایا جاسکتا ہے۔اس کی دلیل "جامع ترمذی، سنن ابوداؤد اور سنن نسائی" میں حضرت عبدالرحمٰن بن طرفہ کی روایت کردہ حدیث ہے۔جس میں وہ کہتے ہیں۔

"ان جده عرفجة ابن اسعد قطع انفه يوم الكلاب فاتخذ انفامن ورق فانتن عليه فامره النبی ﷺ ان يتخذ انفامن ذهب"

ترجمہ: "ان کے دادا عرفجہ بن اسعدی کی جنگ کلاب میں ناک کٹ گئی۔انہوں نے چاندی کی ناک بنوا کر لگوائی اس میں بدبو پیدا ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں (اس کی جگہ) سونے کی ناک لگوانے کا حکم ارشاد فرمایا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگرچہ سونا مرد کیلئے جائز نہیں مگر بوقت ضرورت اس کا استعمال نہ صرف جائز ہے بلکہ حکم رسول ﷺ ہے۔اس حدیث کے تحت امام ابوعیسیٰ ترمذی نے لکھا ہے۔

"قدروی من غير واحد من اهل العلم انهم شدّدوا اسنانهم بالذهب وفی هذا الحديث حجة لهم"

ترجمہ: بہت سے اہل علم سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے دانتوں کو سونے کے ساتھ باندھا۔اس حدیث میں ان کیلئے حجت ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے۔

"وبه اباح العلماء اتخاذ الانف ذهبا و كذا ربط الاسنان بالذهب"

یعنی اس حدیث کی رو سے علماء نے سونے کی ناک بنوا کر لگوانے اور سونے کے ساتھ دانتوں کو باندھنے کو جائز قرار دیا ہے۔

چہرے کی پلاسٹک سرجری

یہاں ایک سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ چہرے کی پلاسٹک سرجری شرعاً جائز ہے کہ نہیں۔ اگرچہ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے لیکن میرے نزدیک سخت ضرورت اور حاجت کے وقت چہرے کی پلاسٹک سرجری جائز ہے۔ ضرورت سے میری مراد یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا چہرہ جھلس جائے یا مسخ ہو جائے تو ساری زندگی اسی حالت میں گزارنے کی بجائے اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو چہرے کی پلاسٹک سرجری کروا سکتی ہے لیکن بلا ضرورت محض فیشن، زیب و زینت اور بڑھاپے میں جوان نظر آنے کیلئے چہرے کی پلاسٹک سرجری (جیسا کہ ہمارے ملک کی اداکارائیں چہرے کی پلاسٹک سرجری کرواتی ہیں) شرعاً ناجائز دولت کا اسراف اور "تغیر خلق" کے زمرے میں آئے گا۔ اس کی دلیل حدیث عرفجہ کے علاوہ بعض اور قرائن ہیں۔

جانوروں کے اعضاء سے انسانی جسم میں پیوندکاری

شریعت اسلامیہ میں مذبوح اور حلال جانوروں کے اعضاء سے انسانی جسم میں پیوندکاری جائز ہے۔ اس کی دلیل سورہ نحل کی یہ آیت کریمہ ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝

"اور اس (ذاتِ باری تعالیٰ) نے چوپایوں کو پیدا فرمایا تمہارے لیے اس میں گرم لباس اور بہت سے فوائد ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو"۔

اس آیت کریمہ میں لفظ "منافع" بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ان فوائد کا دائرہ

بڑا وسیع ہے جو انسان جانوروں سے حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا اس انتفاع سے جانوروں کے اعضاء سے علاج اور انسانی جسم میں ان کی پیوندکاری بھی شامل ہوگئی۔

مذکورہ آیت کریمہ کے علاوہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب درمختار میں ہے

"شعر الميتة غير الخنزير على المذهب وعظمها وعصبها على المشهور وحاضرها وقرنها خالية عن الرسومة طاهر"

ترجمہ: خنزیر کے سوا مردار کے بال امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق اور ہڈی اور پٹھے مشہور روایت کے مطابق اور اس کے کھر اور سینگ جو چکناہٹ اور چربی سے خالی ہوں وہ پاک ہیں۔ اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں ہے

"قال محمد رحمة الله عليه ولا بأس بالتداوى بالعظم اذا كان عظم شاة او بقرة او فرس او غيره من الدواب الاعظم الخنزير والادمى فانه يكره التداوى بهما"

ترجمہ: امام محمدؒ نے فرمایا جانوروں میں سے بکری، گائے، اونٹ، گھوڑے اور کسی بھی چوپائے کی ہڈی سے علاج کروانے میں کوئی حرج نہیں سوائے خنزیر اور آدمی کی ہڈی کے کیونکہ ان سے علاج مکروہ ہے۔

مذکورہ دلیلیں تو عام حالات میں حلال جانوروں کے اعضاء سے انتفاع اور انسانی جسم میں ان کی پیوندکاری کے جواز سے متعلق تھیں مگر مجبوری کے عالم میں جب کوئی حلال جانور موجود نہ ہو یا مل نہ رہا ہو اور ماہر ڈاکٹر (Specialist Doctor) اس بات کی یقین دہانی کرا دے کہ فلاں حرام جانور کے اعضاء کے استعمال سے مریض کی زندگی بچ سکتی ہے تو شریعت میں "فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کی قید کے ساتھ حرام جانوروں کے اعضاء سے بھی انسانی جسم میں پیوندکاری جائز ہوگی۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

"ویجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتداوی اذا اخبره طبیب ان شفاءہٗ فیه ولم یجد فی المباح مایقوم مقامه"

ترجمہ: مریض کیلئے خون، پیشاب اور مردار بطور دوا کھانا جائز ہے۔ جبکہ معالج یہ بتائے کہ مریض کی شفا اسی میں ہے اور اس وقت کوئی مباح چیز اس کے قائم مقام نہ مل رہی ہو۔ یہ فقہی وضاحت اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مجبوری کے عالم میں مردہ یا حرام جانور کے اعضاء سے انسانی جسم میں پیوند کاری کی جا سکتی ہے۔

گردہ کی تبدیلی

اعضاء کی پیوند کاری کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک انسان جس کے دونوں گردے سلامت ہوں اپنا ایک گردہ کسی ایسے انسان کو دے دے جس کے دونوں گردے بیکار ہو جانے کی صورت میں اس کی زندگی کی شمع بجھ رہی ہو مگر اس میں شرط یہ ہے کہ ایسا صرف بوقت شدید حاجت رضا کارانہ طور پر ہو۔ گردوں کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے۔ نیز گردہ دینے والے کو کسی ماہر ڈاکٹر سے تصدیق کروا لینی چاہیے کہ ایک گردہ دینے سے اس کی صحت اور جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ رضا کارانہ طور پر اپنے مسلمان بھائی کو گردہ دینے والا قرآنی آیت

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا

کے مطابق ایک انسان کی زندگی بچا کر گویا ساری انسانیت کو زندگی بخش رہا ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی سورۃ حشر کی یہ آیت کریمہ بھی ہے

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

ترجمہ: اور وہ اپنی جانوں پر ان (اپنے مسلمان بھائیوں) کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں شدید محتاجی ہو۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں بھی اگر ایک انسان اپنا ایک گردہ رضا کارانہ

طور پر اپنے مسلمان بھائی کو دیتا ہے اور اس کی زندگی کے چراغ کو گل ہونے سے بچاتا ہے تو شرعاً اس کا یہ فعل نہ صرف جائز بلکہ محمود اور مستحسن ہوگا۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر کسی جگہ رضا کارانہ گردہ دینے والا کوئی شخص نہ مل رہا ہو تو جان بلب مریض کیلئے گردہ خریدنا بھی جائز ہوگا کیونکہ فقہی قاعدہ ہے

''الضرورات تبیح المحظورات''

ترجمہ: یعنی ضروریات ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہیں۔

جیسا کہ مجبوری کی حالت میں انسان کا اپنی زبان سے کلمہ کفر کہنا جائز ہے جبکہ اس کا دل اللہ اور اس کے رسول مقبول ﷺ کی صداقت کی شہادت فراہم کر رہا ہو اسی طرح فقہاء کے نزدیک کھانا کھاتے وقت اگر کسی انسان کے حلق میں لقمہ اٹک جائے اور پانی نہ مل رہا ہو تو شراب کے گھونٹ سے اس لقمے کو حلق سے نیچے اتارنا جائز ہے۔ اس کی دلیل مذکور ''حدیث عرفجہ'' بھی ہے۔ سونے کا مرد کیلئے ناجائز ہونے کے باوجود بوقت ضرورت خود شارع نے اس کے جواز کا حکم دیا ہے۔ مذکورہ دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ ایک انسان کا گردہ رضا کارانہ بلا معاوضہ لیکن بوقت اشد ضرورت بالمعاوضہ بھی دوسرے انسان کے جسم میں لگایا جا سکتا ہے۔

آنکھ کا عطیہ

انسانی اعضاء کی پیوند کاری کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی زندگی ہی میں وصیت کر جائے کہ میرے مرنے کے بعد میرا فلاں عضو کسی ضرورت مند کو دے دیا جائے تو اس کے وصال کے بعد اس کے ورثاء کی اجازت و رضامندی سے عضو کاٹ کر کسی ضرورت مند کے جسم میں لگانا جائز ہے۔ اگر ورثاء اجازت نہ دیں تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی میں آنکھ کا عطیہ بھی شامل ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی موت سے پہلے وصیت کر جائے کہ میرے مرنے کے بعد میری ایک یا دونوں آنکھیں

نکال کر حاجت مند لوگوں کو بطور عطیہ دے دی جائیں تو اس کے وصال کے بعد اس کے ورثاء کی اجازت سے اس کی آنکھیں نکال کر ضرورت مندوں کو دینی شرعاً جائز ہیں۔ اس کی دلیل ''ترمذی اور مشکوٰۃ'' میں موجود حدیث مبارک کا وہ حصہ جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

''ونصرک الرجل الرذی البصرلک صدقة''

یعنی تیرا کسی اندھے کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔

اس روایت میں لفظ ''نصرک'' اپنے اندر بڑا جامع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں کسی اندھے کو سڑک پار کروانا اور اس کی مالی مدد کرنے کے علاوہ اس کیلئے اپنی آنکھ کے عطیے کی وصیت کر جانا بھی شامل ہے۔

جن علمائے کرام نے آنکھ کا عطیہ یا کسی مردہ کے جسم کو کاٹنے کو ناجائز قرار دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ ''مثلہ'' ہے اور اس سے انسان کی میت کی پامالی اور بے حرمتی لازم آتی ہے۔ ان کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ ایک فقہی قاعدہ ہے جس کو محقق ابن نجیم نے ''الاشباہ والنظائر'' میں بیان کیا ہے

''اذا تعارض مفصلا تان روعی اعظمهما ضررا بارتکاب اخفهما''

یعنی جب دو برائیاں درپیش ہوں تو بڑی برائی کو چھوڑ کر چھوٹی برائی اختیار کر لی جائے۔

چنانچہ مذکورہ مسئلہ میں بھی دو مسئلے جمع ہیں۔ ایک میت کی بے حرمتی جو کہ چھوٹی کراہت ہے بہ نسبت قیمتی انسانی جان کے ضیاع کے جو کہ بڑی کراہت۔ لہٰذا ایک انسان کی آنکھوں کی بینائی کیلئے چھوٹی برائی (میت کی بے حرمتی) کو چھوڑ دیا جائے گا اور اس کا ایک عضو کاٹ کر یا اس کی وصیت کے مطابق اس کے ورثاء کی

اجازت سے اس کی آنکھ نکال کر ضرورت مند کو دینا جائز ہوگی۔ اسکی تصدیق ایک اور فقہی جزئیت سے بھی ہوتی ہے کہ اگر ایک انسان بھوک سے نڈھال ہو اور اس کی جان کو خطرہ ہو اور اس کے پاس ایک طرف غیر کا مال ہو اور دوسری طرف مردار ہو تو علامہ طحاویؒ اور امام کرخیؒ کا قول ہے کہ مردار کھانا بڑی برائی ہے اور غیر کا مال کھانا چھوٹی برائی ہے لیکن اسے اجازت دی جائے گی کہ وہ مردار کو چھوڑ کو غیر کا مال کھالے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایک انسان کی جان بچانے کیلئے مردہ انسان کا کوئی عضو کاٹنا یا اس کی آنکھ نکال کر نابینا انسان کو دینا جائز ہوگا۔ حضرت امام شاہ رضا خان بریلویؒ کا ایک قول ہے ''سب فرضوں میں سے اہم فرض کسی کی جان بچانا ہے۔'' اسی طرح فقہ حنفی کی ایک کتاب ''البحر الرائق'' میں اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔

''لان ذالک تسبب فی احیاء نفس محترمة بترک تعظیم المیت فالاحیاء اولی''

ترجمہ: یعنی تعظیم میت کے ترک میں ایک مقدس جان کو زندگی مل رہی ہے لہٰذا جان بچانے اور زندگی بخشنے کو ترجیح دی جائے گی۔

جن علماء نے اس مسئلہ کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے ان کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ اس میں اضطرار دو طرفہ نہیں بلکہ یک طرفہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مردے کے جسم کا کاٹنا یا آنکھ نکالنا جائز نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اضطرار کیلئے ضروری نہیں کہ دونوں اطراف میں پایا جائے بلکہ ایک طرف کا اضطرار ہی دوسری طرف کے اضطرار اور اس کی اباحیت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کی دلیل فقہاء اسلام Muslim Jurists میں سے امام اعظمؒ، اما شافعیؒ اور امام مالکؒ کا یہ متفقہ قول ہے کہ کوئی عورت مر جائے اور اس کے پیٹ میں زندہ بچہ ہو تو عورت کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکالنا جائز ہوگا۔ اب یہاں اضطرار کی حالت بچہ کی ہے نہ کہ ماں کی لیکن اس سے بچے کے اضطرار کی وجہ

سے ماں کا اضطرار نہ ہونے کے باوجود اس کا پیٹ چاک کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ انسان اپنے اعضاء کی وصیت نہیں کرسکتا کیونکہ اپنے اعضاء پر اسے ملکیت حاصل نہیں اور تصرف صرف ملکیت میں ہوسکتا ہے تو ان حضرات سے گزارش یہ ہے کہ اگرچہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ رب العزت ہی ہے لیکن اس نے اپنے خلیفہ کو بے شمار چیزروں میں اختیاری ملکیت اور ان میں تصرف کا حق دیا ہے اس کی دلیل سورۂ نساء کی آیت کریمہ ہے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

تو اگرچہ حقیقی ملکیت اللہ پاک کی ہے لیکن اس نے مسلمان باندیوں کی ملکیت اور اس میں تصرف کا حق دیا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ انسان اپنے جسم کا اختیاری مالک ہے اس کو اس میں تصرف کا بھی حق ہے نیز وہ اپنے مرنے سے قبل اپنے اعضاء ضرورت مندوں کو دینے کی وصیت کرسکتا ہے۔

انتقالِ خون

شریعت اسلامیہ میں سابق مسائل کی طرح خون کا عطیہ دینا بھی جائز ہے لیکن اس میں بھی سابقہ شرائط ہی ہوں گی کہ مریض کی ہلاکت یا تکلیف شدید کا خطرہ ہوتو دوسرا انسان اسے رضا کارانہ اپنا خون دے سکتا ہے۔ لہٰذا محض حسن و جمال یا جسم کی مضبوطی کیلئے خون لینا جائز نہیں ہوگا۔ نیز خون کی بھی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے لیکن پھر وہی صورت کہ اگر کوئی رضا کارانہ خون دینے والا نہ مل رہا ہوتو خون کا خریدنا بھی جائز ہوگا۔ اس مسئلہ کی دلیل صحیح بخاری کی حضرت انسؓ سے روایت کردہ حدیث ہے۔

"قال قدم اناس من عرينة فاجتووا المدينة فامرهم النبی ﷺ بلقاح وان يشربو امن ابوالها والبانها فانطلقوا فلما صحوا قتلو اراعی النبی ﷺ" [15]

ترجمہ: انہوں نے فرمایا کہ عکل یا عرینہ سے کچھ لوگ آئے انہیں مدینہ (کی آب و ہوا) راس نہ آئی اور بیمار ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پئیں۔ جب وہ تندرست ہو گئے تو انہوں نے حضور پاک ﷺ کے چرواہوں کو قتل کر دیا۔

مذکورہ حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بیماری کے عالم میں پیشاب جیسی نجس چیز بھی بطور علاج جائز ہے لہٰذا خون اگرچہ حرام ہے لیکن کسی کی جان بچانے کیلئے خون دینا شرعاً جائز ہوگا۔ مذکورہ حدیث کے علاوہ ایک فقہی جزئی بھی ہے کہ

''ولا بأس بان یسقط الرجل بلبن المراۃ ویشربہ للدواء'' [16]

''یعنی اس میں کوئی حرج نہیں کہ بطور علاج مرد کی ناک میں عورت کا دودھ ڈال دیا جائے یا اسے پلا دیا جائے'' تو اس سے ثابت ہوا کہ دودھ کے جزء انسانی ہونے کے باوجود جب اس سے انتفاع جائز ہے کہ ضرورت کے وقت حرام مباح ہوگا تو خون کے عطیہ کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ دلائل سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر عورت بوقت ضرورت اپنے خاوند اور مرد اپنی بیوی کو بطور عطیہ خون دیں تو اس سے ان کے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز نسب، رضاعت اور مصاہرت کی حرمت بھی لازم نہیں آئے گی۔ کیونکہ رضاعت میں بھی اڑھائی سال کے بعد دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایک انسان کا دوسرے انسان کو خون بطور عطیہ بوقت شدید ضرورت دینا جائز ہوگا۔

اور مذکورہ بالا تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ شریعت اسلامیہ میں چند شرائط و قیود کے ساتھ انسانی اعضاء کی پیوندکاری، گردہ کی تبدیلی، آنکھ کا عطیہ اور انتقال خون جیسے مسائل شرعاً جائز، مستحب اور مستحسن ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ العظیم

بیمہ (Insurance) کی شرعی حیثیت

بیمہ فارسی زبان کے لفظ بیم سے ماخوذ ہے جس کا معنی خوف و اندیشہ ہے۔ اردو زبان کی مستند لغت ''فرہنگ آصفیہ'' میں ہے ''بیمہ از بیم یعنی اندیشہ ضرر کا ذمہ یا ضمانت۔ جب سوداگر لوگ نقدی یا جنس وغیرہ کہیں بھیجتے ہیں تو وہ اس شخص کو جو اسکے ضائع یا تلف ہو جانے پر دام بھر دینے کا اقرار کرتا ہے کچھ کمیشن دیتے ہیں۔ اس شرط یا اطمینان کو بیمہ کہتے ہیں۔'' [1]

انگریزی زبان میں اس کا متبادل لفظ انشور (Insure) ہے جس معنی ''یقین دہانی'' ہوتا ہے اور عربی زبان میں اس کو ''عقد التامین'' کہتے ہیں یعنی معاہدہ امان۔ الغرض بیمہ، انشور اور تامین سب میں حفظ و امان کا مفہوم قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے۔

بیمہ کا آغاز

مشہور تو یہ ہے کہ بیمہ کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں ہوا لیکن صحیح یہ ہے کہ بیمہ کا آغاز سترھویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں تجارتی مقاصد کیلئے لندن کے کافی ہاؤسز میں ہوا۔ ان ہاؤسز میں بحری جہازوں کے مالکان اور کپتان اپنے کاروبار اور سمندری حوادث سے ہونے والے نقصان پر بحث کرنے کیلئے اکٹھے ہوتے تھے۔ اس مقصد کیلئے لندن کے تمام کافی ہاؤسز (Coffi Houses) میں سے مشہور ''ایڈورڈ لائیڈز'' تھا۔ بحث و مباحثہ کے بعد جہازوں کے مالکان اس نتیجہ پر پہنچے کہ انہیں سمندری حوادث کے نقصانات کی تلافی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کیلئے علیحدہ شعبہ قائم کرنا چاہیے۔ ان کے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے سب سے قدیم قسم بحری بیمہ

(Marine insurance) وجود میں آئی۔ اٹھارویں صدی کے شروع تک اس پر بڑے بڑے سرمایہ داروں کا غلبہ رہا۔ 1680ء میں "Nicholas barbon" نے تاجروں کے ایک گروہ کو اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ اس کے آگ کے بیمہ(Fire Insurance) اور عام بیمہ میں شریک ہوں۔ اس طرح(Phoenix insurance office) کا قیام عمل میں آیا اور اس کے بعد 1760ء میں(London insurance-co-sun-fire office) اور Royal exchange insurance قائم ہوئیں۔ اس کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ بیمہ کو تجارتی اہمیت حاصل ہوگئی۔

بیمہ کا اسلامی پہلو

قبل اس کے کہ میں بیمہ کی تعریف لکھوں اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بیمہ سے ملتی جلتی ایک شکل آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے قبل عرب معاشرے میں موجود تھی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ چند قبائل یا خاندان مل کر کچھ مخصوص رقم ایک قبیلے کے پاس جمع کراتے رہتے تھے جس کو وہ کسی بھی ناگہانی آفت کی صورت میں استعمال کر لیتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے وقت عرب میں یہ رسم موجود تھی اس کی بنیاد چونکہ منفعت عامہ تھی چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن قبل از اسلام رسومات (Pre-Islamic traditions) کو باقی رکھا ہے ان میں یہ صورت بھی شامل تھی جو بظاہر تو بیمہ سے ملتی جلتی ہے لیکن جدید بیمہ اور اس عربی رسم کی ہیت ترکیبی میں کافی فرق تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رسم کو اس لیے باقی رکھا کہ یہ روح اسلام سے متصادم نہیں تھی لیکن بعد کا معاملہ جدا ہے۔

اس کے علاوہ علامہ شامی نے "مستامن" کے احکام میں "سوکرہ" کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔ [2]

بیمہ کی تعریف

آسان الفاظ میں بیمہ دو افراد کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہوتا ہے جس میں ایک فریق (بیمہ کمپنی) دوسرے فریق (بیمہ کروانے والے) سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر اس کی جان یا مال کو کسی وجہ سے نقصان پہنچے تو وہ اس نقصان کی تلافی کرے گا۔ نقصان کی اس ذمہ داری کے قبول کرنے کے بدلے بیمہ کروانے والا کمپنی کو ایک خاص رقم ادا کرتا رہتا ہے جسے پریمیم (Premium) یا قسط بیمہ کہا جاتا ہے جس کاغذ پر یہ معاہدہ کیا جاتا ہے اسے بیمہ پالیسی (Insurance Policy) کہتے ہیں اور وہ رقم جن کیلئے بیمہ کروایا جائے اس کو بیمہ شدہ رقم کہتے ہیں۔

بیمہ کی مندرجہ بالا تعریف سے ثابت ہوا کہ بیمہ سے خطرات کو ختم نہیں کیا جا سکتا جبکہ وہ خطرات بیمہ کمپنی کو منتقل کر دیئے جاتے ہیں اور کمپنی کو ان خطرات کو قبول کرنے کا معاوضہ قسط کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے۔

بیمے کی اقسام

ویسے تو بیمے کی بہت سے اقسام ہیں لیکن ہم اس مقالہ میں بیمہ کی صرف دو اقسام پر بحث کریں گے۔

(i) بیمہ زندگی جس کو انگریزی میں Life Insurance جبکہ عربی میں "تامین الحیاۃ" کہتے ہیں۔

(ii) تجارتی بیمہ اس کو انگریزی میں Commercial Insurance جبکہ عربی میں "التامین التجاری" کہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم پہلی قسم پر بحث کرتے ہیں۔

ا۔ بیمہ زندگی یا تامین الحیاۃ (Life Insurance)

اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ کمپنی بیمہ دار سے معاہدہ کرتی ہے کہ اگر مخصوص

مدت میں بیمہ دار کا انتقال ہو گیا تو بیمہ کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں بعض اوقات مدت مقرر ہوتی ہے اور بعض اوقات مدت مقرر نہیں ہوتی۔ اگر مدت مقرر ہو اور اس مدت مقررہ کے اندر بیمہ دار کا انتقال ہو جائے تو بیمہ کی رقم اس کے ورثاء کو مل جاتی ہے اور اگر مدت کے اندر بیمہ دار کا انتقال نہ ہو تو مدت گزرنے سے بیمہ ختم ہو جاتا ہے اور بیمہ کی رقم بمعہ سود اس کو واپس مل جاتی ہے اور جن صورتوں میں مدت مقرر نہیں ہوتی ان میں جب بھی بیمہ دار کا انتقال ہو گا تو بیمہ کی رقم ورثاء کو مل جائے گی۔

۲۔ تجارتی بیمہ یا التامین التجاری

(Commercial Insurance)

اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ ایک بیمہ کمپنی قائم کی جاتی ہے جس کا مقصد بیمہ کے ذریعے نفع کمانا ہوتا ہے یہ کمپنی پیسے کے ذریعے مختلف اسکیمیں جاری کرتی ہے جو شخص بیمہ کرانا چاہتا ہے اس کے ساتھ بیمہ کمپنی کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم کی اتنی قسطیں آپ ادا کریں گے اور نقصان کی صورت میں کمپنی آپ کے نقصان کی تلافی کرے گی۔ بیمہ کی اس قسم کا رواج زیادہ ہے۔

جسٹس مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ بیمے کی اس قسم کے شرعی حکم کے بارے میں معاصر علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کے بارے میں علمائے عرب میں سے شیخ ابوزہرہ اور مصطفیٰ الزرقا کا اختلاف شدید رہا ہے۔ شیخ ابوزہرہ اس کی حرمت کے قائل تھے جبکہ مصطفیٰ زرقا اس کے جواز کے قائل تھے اس وقت عالم اسلام کے تقریباً تمام علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں البتہ مشاہیر میں سے دو عالم اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ایک شیخ مصطفیٰ زرقاء اور دوسرے شیخ علی الخفیف۔

اور جمہور علماء اس کی حرمت کے اس لیے قائل ہیں کہ اس بیمہ میں قمار بھی

ہے اور ربوٰ بھی ہے۔ قمار اس لیے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے جو قسطیں ادا کی گئیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے اور اسی کو قمار کہتے ہیں اور ربوٰ اس طرح کہ اس میں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے، اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے رقم کم دی جاتی ہے اور اسے رقم ملتی زیادہ ہے البتہ تامین الحیاۃ یعنی بیمہ زندگی میں قمار نہیں لیکن اس میں بھی ربوٰ اور غرر موجود ہے۔ ربوٰ تو ظاہر ہے اور غرر کا مطلب یہ ہے کہ ارکان عقد (ثمن، مبیع یا اجل) میں سے کسی کا مجہول ہونا یا کسی مجہول یا غیر معین واقعہ پر موقوف ہونا۔ یہاں غرر اس طرح ہے کہ معلوم نہیں کتنی رقم واپس ہوگی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جتنی رقم دی تھی وہی رقم بمعہ سود واپس مل جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حادثے کی صورت میں رقم زیادہ واپس ملے۔ ؎۳

بیمہ اور مفاسد

بیمہ کی روح اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے یعنی اضطراری حالت میں کسی خاندان کی معاشی کفالت کا بندوبست کرنا لیکن درج ذیل مفاسد کی وجہ سے بیمہ شرعی اعتبار سے ناجائز ٹھہرتا ہے۔

۱۔ قمار ۲۔ سود ۳۔ مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا

۴۔ غبن وغش ۵۔ اکراہ ۶۔ ضرر

۱۔ قمار

قمار سے مراد جوا بازی ہے۔ اس کے غیر مشروع ہونے میں حکمت یہ ہے کہ جوا کھیلنے والا شرط باندھ کر اپنے لیے ایک ایسا خطرہ مول لیتا ہے جو پہلے سے موجود نہیں تھا یا اگر پہلے سے موجود تھا لیکن اس کی ذات سے متعلق نہیں تھا مثلاً لاٹری کے ٹکٹ خریدنا، کرکٹ، فٹ بال اور تاش وغیرہ میں ہار جیت پر بازی لگانا اس کی عام

مثالیں ہیں۔

قرآن مجید میں جوئے کیلئے میسر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میسر یہ لفظ مفسرین کے نزدیک یسر (آسانی، سہولت) سے نکلا ہے یعنی جوا کھیلنے والا بغیر کسی محنت کے آسانی کے ساتھ دولت حاصل کرنا چاہتا ہے اس لیے جوئے کو میسر سے تعبیر کیا گیا ہے اور بعض محققین کے نزدیک یہ لفظ میسر دھوکہ بازی اور چالبازی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی ایسا خطرہ مول لینا جس میں نقصان کا اندیشہ بھی ہو اور نفع کی امید بھی ہو لیکن وہ زندگی کی کسی نارمل سرگرمی سے وابستہ نہ ہو۔

اور بیمہ زندگی کے علاوہ بیمہ کی تمام اقسام میں قمار پایا جاتا ہے لہٰذا شریعت مطہرہ نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اگر انشورنس کمپنیاں بیمہ کو قمار اور دیگر مفاسد سے پاک کر لیں تو پھر یہ عمل جان بلب خاندانوں کو حیاتِ نو بخشنے کا سبب بن سکتا ہے۔

۲۔ سود

سود کی حرمت چونکہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی اور بیمہ میں انشورنس والے جو قسط ادا کرتے ہیں ان سے ایک کثیر سرمایہ انشورنس کمپنیوں کے پاس جمع ہو جاتا ہے جسے وہ مشغول رکھنا چاہتی ہیں تاکہ نقصان کا اندیشہ کم از کم ہو اور اصل سرمایہ کے تحفظ کے ساتھ اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ مروجہ نظام میں اس کی عملی شکل سودی تمسکات (Socurities) کی خریداری ہے۔

۳۔ غش اور غبن وغیرہ

انشورنس ادارے اگر مقدار سے زیادہ قسطیں وصول کریں تو اسے غبن قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر انشورنس کرانے والا اپنی مالی حیثیت یا جن املاک کی انشورنس وہ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے کی ملکیت کے بارے میں اگر وہ غلط بیانی سے کام لے تو یہ

غش کی تعریف میں آئے گا۔

اور شریعت محمدی نے غبن و غش دونوں سے منع فرمایا ہے۔ غبن کے بارے میں حدیث نبوی ہے

''جس نے کسی کی زمین بالشت بھر بھی ''غبن'' کر لی تو قیامت کے روز سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ [4]

اور غش کے بارے میں واضح حدیث نبوی ہے

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا یعنی جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

مندرجہ بالا مفاسد کی وجہ سے انشورنس کا کاروبار ناجائز ٹھہرتا ہے کیونکہ اسلام کسی فرد کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور نہ ہی کسی فرد کو بغیر محنت یا سرمائے کے محض گھر بیٹھے امیر بنا کر دوسروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اسلام مضاربہ و مشارکہ کا نظام متعارف کروا کر افرادِ معاشرہ کو مفید بنانا چاہتا ہے۔

بیمہ زندگی کا متبادل شرعی حل

عمومی طور پر جس کسی مسئلہ پر عدم جواز کی رائے دی جائے تو محض عقل کے دائرے میں سوچنے والا طبقہ چیخ اٹھتا ہے کہ پھر اس مسئلے کا متبادل حل کیا ہے۔

نامور ماہر معاشیات حکیم ایم اے قاسم نے اپنی کتاب حضرت محمد ﷺ بحیثیت ماہر معاشیات میں بیمۂ زندگی کا متبادل حل پیش کیا ہے آپ لکھتے ہیں

''کسی شخص کو علیحدہ سے بیمہ زندگی کرانے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ مرنے والے کے زیر کفالت افراد کی معاشی ضروریات کا بندوبست کرے کیونکہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ حکومت اس شخص سے زندگی میں زکوٰۃ، عشر اور خمس وصول کرے مگر اس شخص کے انتقال کے بعد اس کے بیوی بچوں کی معاشی کفالت کی ذمہ داری اٹھائے کیونکہ اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی

ریاست میں بسنے والے انسانوں کی بنیادی ضروریات (Basic Wants) کی تکمیل کا اہتمام کرے۔ یہاں تک کہ کوئی فرد بھی محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج شامل ہے۔ جیسے حدیث پاک میں رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''السطان ولی من لاولی له'' ۵

یعنی جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرستی کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ کفالت عامہ کی ذمہ دار حکومت ہے جب معاشرے کے محروم افراد کی کفالت کی ذمہ داری حکومت کی ہے تو پھر علیحدہ سے بیمہ زندگی کی شرعی ضرورت نہیں رہتی۔ ۶

تجارتی بیمہ کا متبادل شرعی حل

تجارتی بیمے کا بھی علمائے کرام نے ایک متبادل شرعی حل بیان فرمایا ہے جس کو عربی زبان میں ''التأمین التبادل'' اور انگریزی میں اس کو ''Mufual Insurance'' کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو ایک جیسے خطرات درپیش ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر ایک مشترکہ فنڈ بنالیں اور یہ طے کرلیں کہ ہم میں سے اگر کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس مشترکہ فنڈ سے اس نقصان کی تلافی کی جائے گی۔ اس فنڈ میں صرف ممبران کی رقم ہوگی اور ممبران کی حد تک ہی نقصان کی تلافی بھی ہوگی۔ سال کے بعد حساب کرلیا جائے اگر ادا کیئے گئے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اس حساب سے ممبران سے اضافی رقم وصول کرلی جائے اور اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو واپس کردی جائے۔ یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ میں جمع کرلی جائے۔

ابتداء میں بیمہ کی یہ شکل رائج تھی علمائے اسلام میں سے کسی نے بھی بیمے کی اس شکل پر اعتراض نہیں کیا۔

متذکرہ بالا صورت سے ملتی جلتی صورت پر بعض اسلامی ملکوں میں اب ''شرکات التافل'' کے نام سے کمپنیاں وجود میں آئی ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ ان کا معاشی ڈھانچہ ہے جو مضاربہ اور مشارکہ کے نظام سے ملتا ہے۔ اس میں ہر بیمہ دار کمپنی کا شیئر ہولڈر ہوتا ہے لہٰذا اس میں غرر، غبن، قمار نہیں پایا جاتا۔

بیمہ سے متعلق فقہاء کے بعض فتاویٰ جات

بعض علمائے اسلام نے بیمہ کے بارے میں اپنی فقہی آراء کا یوں اظہار فرمایا ہے۔

۱۔ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمتہ اللہ علیہ

آپ بیمہ کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ بالکل قمار ہے اور محض باطل کہ کسی عقد شرعی کے تحت میں داخل نہیں ہے۔ ایسی جگہ عقود فاسدہ بغیر عذر کے جو اجازت دی گئی ہے وہ اس صورت سے مقید ہے کہ ہر طرح ہی اپنا نفع ہو اور ایسا کمپنیوں سے متوقع نہیں لہٰذا اجازت نہیں۔ ؎

۲۔ علامہ عبدالحکیم شرف قادری رحمتہ اللہ علیہ

اس معاہدے میں کئی وجہ سے غرر پایا جاتا ہے

۱۔ بیمۂ زندگی کے علاوہ تمام اقسام بیمہ میں معاہدہ کے وقت بیمہ کی رقم موجود اور متعین نہیں ہوتی جب تک خطرہ واقع نہ ہوجائے اس کی تعیین نہیں ہوتی یہ غرر فی الوجود والتعیین ہے۔

۲۔ بیمۂ زندگی کے علاوہ باقی قسموں میں مدت بیمہ گزر جانے کے باوجود حادثہ پیش نہیں آتا تو بیمہ کی رقم سوخت ہوجاتی ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا یہ غرر فی الحصول ہوا۔

۳۔ زندگی کے بیمہ کے علاوہ اقسام میں اگرچہ رقم کی زیادہ سے زیادہ مقدار معین کردی جاتی ہے لیکن نقصان ہونے پر نقصان کے تناسب سے معین کی جاتی

ہے یہ غرر فی المقدار ہے جب کہ بیمہ کی قسط فوری طور پر ادا کر دی جاتی ہے۔

۴۔ بیمہ کی تمام قسموں میں بیمہ کی قسط ادا کرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے جب کہ بیمہ کی رقم ادا کرنے کا وقت متعین نہیں ہوتا، کیونکہ موت اور حادثے کا وقت متعین طور پر ہمیں معلوم نہیں ہے یہ غرر فی الاجل ہے۔

پھر یہ عقد، قمار بھی ہے جیسے امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے فتاویٰ رضویہ (جلد ہفتم ص ۱۱۳) میں فرمایا ہے۔

اس میں ربا کا پہلو بھی موجود ہے کیونکہ مستامن نے جتنی رقم جمع کروائی ہے اس پر بیمہ کمپنی کے قواعد کے مطابق معین نفع بھی دیا جاتا ہے۔

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ کیا ہندوستان کے اہل حرب سے ربا لینا جائز ہے؟ خواہ وہ ہنود ہوں یا نصاریٰ

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

۱۔ بحمدہٖ تعالیٰ ہندوستان دارالاسلام ہے۔

۲۔ ربا کے بارے میں حق یہ ہے کہ مطلقاً ناجائز ہے، کیونکہ نصوص تحریم مطلق ہیں۔

۳۔ باقی رہا دارالحرب میں زائد مال کا لینا وہ ربا ہے ہی نہیں، کیونکہ ربا مال معصوم میں ہوتا ہے اور دارالحرب والوں کا مال معصوم نہیں ہے۔

۴۔ یہ حکم ہر حربی غیر مستامن کو شامل ہے، اگرچہ وہ دارالاسلام میں ہو، کیونکہ دارومدار معصوم نہ ہونے پر ہے اور عدم عصمت سب کو شامل ہے، ہم پر ان کے ساتھ صرف غدر (دھوکہ) ناجائز ہے۔ اس کے بغیر ان کا مال جس عنوان سے بھی لے لیا جائے جائز ہے، کیونکہ یہ مال مباح لیا گیا ہے (شرط یہ ہے کہ بہ نیت نہ ہو کہ میں سود لے رہا ہوں، ورنہ ناجائز ہوگا)۔

۵۔ اس کے باوجود بطور تنبیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حربی غیر مستامن سے زائد

مال اعلانیہ لے گا اگرچہ وہ صحیح نیت کے ساتھ لے گا، لیکن عوام اس پر ربا خوری کا الزام لگائیں گے، چونکہ تہمت کے مقامات سے بچنا چاہیے اس لیے دینی حیثیت رکھنے والے حضرات کو اس سے بچنا چاہیے۔ ۸

مندرجہ بالا توضیحات سے ثابت ہوا کہ بیمہ کی موجود شکل کسی طرح بھی اسلامی شریعت کے دائرے میں نہیں آتی اور اس سے بچنا چاہیے۔

مصادر و مراجع

۱۔ فرہنگ آصفیہ۔ ص ۲۹ ج ۱ ترقی اردو بیورو دہلی

۲۔ ردالمختار۔ ۱۴ ایچ ایم سعید کمپنی

۳۔ اسلام اور جدید معیشت و تجارت از مفتی تقی عثمانی ص ۱۴۱ تا ۱۴۲

۴۔ بخاری شریف

۵۔ ترمذی شریف۔ کتاب النکاح

۶۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بطور ماہر معاشیات۔ از حکیم ایم اے قاسم۔ ص ۲۶۴

۷۔ کما حقق المحقق علی الاطلاق فی فتح القدیر۔ ص ۱۱۳۔ جلد ہفتم و فتاویٰ رضویہ

۸۔ ترجمہ عربی عبارت ملخصاً۔۔۔ فتاویٰ رضویہ۔ جلد ۷۔ ص ۱۱۵

غیر مسلم ملک میں رہائشی سہولت حاصل کرنے کیلئے مکان خریدنا رہن (Mortgage) کی شرعی حیثیت

ہمارے وہ مسلمان بھائی جو حصول رزق کیلئے غیر مسلم ممالک میں مقیم ہیں انہیں وہاں بے شمار ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کے وہ مسلم معاشروں میں عادی نہیں ہوتے۔ بیرون ممالک بالخصوص امریکہ و برطانیہ اور یورپ میں رہنے والے مسلمانوں کی متعدد اقسام ہیں۔ پہلی قسم تو ان لوگوں کی ہے جو زندگی کے کسی بھی معاملہ میں شریعت مطہرہ سے رہنمائی لینے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے وہ اپنے ملک میں رہیں یا بیرون ملک۔ ان کی زندگی کا مقصد واحد صرف دولت اکٹھی کرنا ہوتا ہے۔ انہیں دین اسلام کے احکامات کی روشنی میں زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا۔ جبکہ دوسری قسم ان مسلمانوں کی ہے جو بیرون ملک بھی اسلام کی تعلیمات پر اس سختی کے ساتھ کاربند رہتے ہیں کہ کوئی لالچ اور کوئی دھونس ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکتے۔ گویا ان کی کیفیت یہ ہے کہ

ے مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفان مغرب نے

جبکہ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مغربی سہولیات سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتے ہیں اور شریعت کے احکامات کی خلاف ورزی بھی نہیں چاہتے۔ اس قسم سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگوں کو جب رہائشی سہولیات کیلئے مکان کی ضرورت پڑتی ہے ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی کہ یکمشت (Lumsum) میں مکان خرید سکیں لہٰذا ان کو کچھ ایڈوانس رقم (Down Payment) دے کر باقی اقساط (Instalments) میں ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ اس صورت میں اکثر مسلمان متذبذب رہتے ہیں کہ امریکہ

اور برطانیہ میں رہن (Mortgage) پر مکان لینا جائز ہے یا نہیں۔

میرے برطانیہ و امریکہ کے گزشتہ تبلیغی دورے کے دوران بہت سے لوگوں نے مجھ سے یہ سوال پوچھا جس کا میں اپنے طور پر حتی الوسع جواب دیتا رہا لیکن اس مسئلہ کے بارے میں ایک تشنگی میرے ذہن میں بدستور باقی رہی لہٰذا واپسی پر میں نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا فقہی جائزہ لیا تو جس رائے نے مجھے سب سے زیادہ مطمئن کیا وہ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی اس مسئلہ کے بارے میں تحقیقی رائے ہے۔ آپ اس مسئلہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

جہاں تک Mortage کا تعلق ہے نارتھ امریکہ ہو یا کینیڈا، ویسٹرن ہو یا ایسٹرن غیر اسلامی سوسائٹی دنیا کے ایسے تمام خطوں میں جہاں غیر اسلامی حکومتیں ہوں اور مسلمان اقلیت کی حیثیت سے آباد ہوں یہ صورتحال ہر جگہ یکساں طور پر ہر ایک کو درپیش ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے پانچ چھ مختلف گوشے ہیں۔ آپ یہ سمجھیں کہ اس کے مختلف مرحلے ہیں جنہیں میں ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کوئی مسلمان اس میں شک نہیں کرسکتا کہ interest سود (رباء) کو اللہ رب العزت نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کی حرمت میں بھی کوئی شک نہیں اور اس کی حلت کیلئے کوئی امکان نہیں۔ interest سود (رباء) حرام ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سخت وعید کے ساتھ قرآن مجید میں اس کی مذمت کی اور اس کی حرمت کو بیان کیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت سے مقامات پر اس کی حرمت اور ممانعت بیان فرمائی ہے۔ اس پر لعنت اور اس کی مذمت میں کثیر احادیث موجود ہیں۔ میری دو تصانیف ہیں اسلامی نظام معیشت اور بلا سود بنکاری۔ اس کے پہلے chapter میں قرآن مجید کی وہ آیات کریمہ اور مختلف احادیث جمع کی ہیں جس میں interest سود (رباء) کی

حرمت اور مذمت کا بیان آیا ہے۔ یہ تو ایک زاویہ ہے۔

اب یاد رکھ لیں کہ جب ہم غیر اسلامی معاشرہ و (Un-Islamic Society) سوسائٹی خواہ وہ ویسٹرن سوسائٹی ہے یورپین، ایسٹرن، نارتھ امریکن ہے اس میں جب ہم Mortgage اور Interest Base Loan کی بات کرتے ہیں خواہ وہ کسی Personal needs or requirement ذاتی ضروریات، مکان (Residential Purpose) لینے کیلئے ہو یا کمرشل اور Trade کے مقاصد کیلئے ہو۔ اس میں interest سود (رباء) پر مبنی لین دین، کاروبار ہے۔ یہ سارا مسئلہ دراصل interest سود (رباء) پر انحصار کرنے والی اکنامی اور اس کے (transaction) لین دین کا ہو جاتا ہے۔ اب یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ حرام حرام ہے۔ جو بات میں آگے آپ کو سمجھانے والا ہوں اس کا تعلق اس سے نہیں ہے کہ سود حرام ہے یا نہیں جس نے interest سود (رباء) کو حرام نہیں مانا حلال جانا وہ کافر ہو گیا۔ کیونکہ قرآن مجید کی نص صریح نے اسے حرام کر دیا ہے۔

لہٰذا اس امر میں نہ کوئی شک ہے، نہ بحث، نہ کوئی استثناء ہے اور نہ کوئی جواز کا راستہ نکالنے کی گنجائش۔ یہ بات Categorical حتمی طور پر متعین ہے۔ اب بحث اس سے نہیں کہ سود پر قرضہ لینا دینا جائز ہے یا نہیں۔ ان سوسائٹریز میں جہاں غیر اسلامی حکومتیں ہیں اور غیر مسلموں Non Muslims کی اکثریت ہے اور وہ چھائے ہوئے Dominant ہیں اور مسلمان اقلیت Minorities کے طور پر رہ رہے ہیں جب وہاں یہ مسئلہ اٹھتا ہے تو مسئلہ interest سود (رباء) کے معاذ اللہ حلال یا حرام ہونے کا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک وہاں یہ مسئلہ ان احکام کے نفاذ یا (معطل) عدم نفاذ کا ہے۔ سوال اس کی Permisibility or Prohibition کا نہیں ہے کہ سود جائز ہے یا ناجائز ہے۔ نہیں، یہ واضح ہے کہ سود حرام و ناجائز ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان ممالک اور سوسائٹیز میں ان حالات میں جن میں وہ لوگ رہتے ہیں ان میں یہ احکام نافذ ہوں گے؟ اور نافذ ہوتے ہیں یا نہیں؟ یہ مسئلہ enforcement, execution or implementation کا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرلیں۔

پہلا نقطہ جہاں سے میں بات سمجھانا چاہوں گا کہ لوگ بات کو سمجھیں؟ وہ یہ کہ اسلام نے سود کو حرام کر دیا ہے۔ یہ بات آپ کو معلوم ہونی چاہیے کہ حرمت رباء کے احکام آنے سے پہلے مدینہ طیبہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے مدنی دور کا آخری زمانہ ہے۔ Legislation قانون سازی ہونے کا اعلان اس کے آخری زمانے میں interest سود (رباء) کو حرام declare کیا گیا۔ 23 برس میں 13 برس جو مکی زندگی کے تھے نہ پہلے اس میں حرام Declare کیا گیا اور مدنی زندگی کے ابتدائی کئی سال نہ اس میں حرام Declare کیا گیا۔ حرمت رباء حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال مبارک سے پہلے آخری دو سالوں میں ہوئی۔ Open Decleration حجۃ الوداع کے موقع پر ہوا جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ

"الا كل شيء من امر الجاهلية موضوع تحت قدمي، وان كل ربا موضوع، ولكم رؤوس اموالكم، لا تظلمون ولا تظلمون، قضى الله، انه لا رباء، وان اول ربا، ابدا به ربا عمي العباس بن عبدالمطلب"

"آگاہ رہو! تمام امور جاہلیت میرے قدموں کے نیچے پامال ہیں، اور ہر سودی معاملہ کالعدم اور تمہیں اپنی اصل پونجی لینے کا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ سودی معاملہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور جو سود میرے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کا وصول طلب ہے، سب سے پہلے میں وہ تمام کا تمام ختم کرتا ہوں"۔

فرمایا کہ ایک نیا اکنامک آرڈر امت مسلمہ کو عطا کر رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا۔ اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی اور Constitution of Medina نافذ ہو گیا تھا۔ میثاق مدینہ کی شکل میں ایک سوسائٹی ایک دین ایک آرگنائزیشن قائم ہو گئی تھی ان کئی سالوں میں معیشت مبنی بر سود ہی چلتی رہی یہ کیوں ہوا؟

جب مدینہ طیبہ میں حضور ﷺ نے ہجرت فرمائی آپ ﷺ نے مواخات مدینہ کر لی پھر اس کے بعد میثاق مدینہ کے ذریعے آقا علیہ السلام اور اسلام کی حکومت قائم ہوگئی۔ معاشرہ میں ایک اسٹیٹ اسلامی گورنمنٹ وجود میں آگئی اور حضور ﷺ اس کے سربراہ ہو گئے تو ایسا کیوں نہیں ہوا؟ کہ پہلے ہی سال کے آخر یا دوسرے سال اس کو حرام ڈیکلیئر کر دیا جاتا؟ حرمت کے احکام اس میں بھی نافذ نہیں ہوئے یہ نہیں ہوا کہ سود کی مطلق بات ہے بلکہ شراب اور بہت سے احکامات حلال و حرام کے وہ مکی دور میں نافذ نہیں ہوئے تھے مکی دور میں عقائد کی بات ہوتی رہی تربیت ہوتی رہی اخلاق کی تربیت ہوتی رہی ایمان پختہ کیا جاتا رہا۔ آخرت کا فکر دیا جاتا رہا۔ عقیدہ ختم نبوت و رسالت ﷺ دیا جاتا رہا۔ پہلے مکی دور میں لوگوں کی انفرادی اصلاح انفرادی تعمیر شخصیت عقیدہ و اخلاق کی انفرادی اصلاح پر زور دیا جاتا رہا پھر ہجرت مدینہ ہوئی تو وہ تمام احکام جن کا تعلق اجتماعیت و سوسائٹی، سسٹم اور ایک collective order کے ساتھ ہے خواہ وہ گھریلو زندگی ہے ,Domestic Social life or Political life, Economic life ہے خواہ کلچرل و خواہ انٹرنیشنل لائف ہے یہ تمام احکام جن کا تعلق اجتماعیت کے ساتھ ہے وہ احکام مدنی زندگی میں آئے۔ مکی زندگی میں احکام نافذ نہیں ہوئے اور مدنی زندگی میں بھی احکام ترتیب سے نافذ ہوئے پھر مدنی زندگی کے آخری زمانے میں سودی معیشت interest base loan transection کو حرام ڈیکلیئر کیا گیا اور انہیں مکمل طور

پر منسوخ کر دیا گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دسویں سال حجۃ الوداع کے موقع پر عملی طور پر ان کو منسوخ کر دیا اور جتنے قرضے تھے سود پر مبنی لین دین کے ان کے سود معاف کر دیئے۔ Categorically transaction close کر دیئے اور نئے زمانے سے interest free economy, or interest free borrowing اور interest free transaction کا اعلان فرما دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو اتنا تاخیر سے آخری دور میں کیوں نافذ کیا۔ why not in early stage or begining of Islamic era? Why not in early stage? یہ میں آپ کو پورا فلسفہ دے رہا ہوں یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔

یاد رکھ لیں اگر بات ہو کہ آیا سود، رباء حرام ہے یا اس کے حلال ہونے کی گنجائش ہے تو اس پر کوئی بحث اس لیے نہیں ہو سکتی کہ سود کو حرام میں نے یا آپ یا کسی امام یا امام ابوحنیفہ یا صحابہ کرامؓ نے نہیں کیا۔ سود کو حرام اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک کے متن کے اندر کر دیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی سنت میں کر دیا ہے۔ لہٰذا اس میں مزید قیل و قال کی اور سوچنے کی گنجائش نہیں ہے مگر جب آپ ویسٹرن، غیر مسلم سوسائٹی میں جہاں مسلمان تھوڑی تعداد میں ہوں منارٹی کی شکل میں رہ رہے ہیں وہ وہاں آباد ہو گئے ہیں جہاں Mortgage کی آپ بات کرتے ہیں تو یاد رکھ لیں کہ میری نگاہ میں یہ مسئلہ اجتہادی ہو جاتا ہے کیوں؟ حکم تو وہ اپنی جگہ برقرار ہے مگر صورتحال تبدیل ہو چکی ہے۔

فقہ کا ایک طریقہ ہے کہ حالات بدل جائیں تو بدلے ہوئے حالات میں احکام تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اب غیر اسلامی ممالک وسوسائٹی میں مسلمان اقلیت میں ہیں تو ان کے حالات تبدیل ہو گئے۔ ان حالات میں چونکہ نافذ کرنے والی حکومت ہی نہیں ہے اور کوئی متبادل سسٹم ہی نہیں ہے تو یہاں حکم کا نفاذ بدل جائے گا۔ یہ ایک

بڑا بنیادی و پرائمری Function ہے۔ یہاں مسلمانوں کی رہائشی اور کاروباری ضروریات پورا ہونے و مضبوط ہونے سے اسلامک سوسائٹی اور مسلم کمیونٹی مضبوط ہوگی۔ مسلمان بحیثیت کمیونٹی مضبوط ہوں گے تو مسلمانوں کی مضبوطی اور استحکام سے اسلام مضبوط ہوگا۔ اسلام کے ادارے مضبوط ہوں گے۔ تعلیم عبادت اور تربیت کا نظام مضبوط ہوگا۔ اسلام کو مضبوطی ملے گی۔ امت مسلمہ کو مدد اور فائدہ پہنچے گا۔ لہٰذا امت مسلمہ کی مدد کیلئے اور یہاں کی مسلم کمیونٹی کو کمزور نہ ہونے دینا بلکہ مضبوط رکھنے کی خاطر ایسی اکنامک سہولتوں سے فائدہ اٹھانا درست چیز ہے۔ استثنائی رخصت کے تحت اس کا نفاذ نہیں ہوگا۔

ایک نقطہ آپ کو اور بتاؤں اگر آپ سفر میں ہیں کھانے کیلئے حلال رزق میسر نہیں بھوک اور فاقہ سے موت سامنے آگئی اس حالت میں خنزیر اور شراب بقدر ضرورت کھا کر جان بچانا فرض ہو جاتا ہے یہ صورت آگئی اور کوئی شخص کہے کہ میں تو مر جاؤں گا لیکن جان بچانے کیلئے بھی خنزیر کی بوٹی تک نہیں کھاؤں گا۔ مر جاؤں گا۔ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر وہ مر گیا تو اس نے خودکشی کی وہ حرام موت مارا گیا۔ جان بچانا فرض ہے۔ فرمایا کہ اس حرام سے بچنے کیلئے جان بچانا فرض ہے۔ اللہ کی شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب اللہ تمہارا مالک ہو کر احکام بھیجنے والا مولا جب ایسی صورت میں تمہیں یہ کہتا ہے کہ تم کھا کر جان بچالو تو تم خدا سے بڑا بننا چاہتے ہو؟ خدا نے تمہیں رخصت اور اجازت دے دی ہے تو اس کا کھانا فرض ہے تاکہ جان بچ جائے یہ ایک صورت ہے۔ میں Mortgage کو فرض نہیں کہہ رہا اگر اس سے بچ کر بھی چلا جا سکتا ہے اور گزارہ کر سکتا ہے تو اس کا تقویٰ اللہ اس کا اجر دے گا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو مکلف نہیں ٹھہرایا۔

جیسے دیکھیں سفر میں نماز قصر ہے۔ اب آج کل کے سفر میں وہ تکلیفیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں ہوتی تھیں اب نہیں ہیں اب آپ پچاس

ساٹھ میل کے فاصلہ پر ڈرائیو کرتے ہوئے چلے گئے اور پردیسی بن گئے؟ اور اگر آپ پندرہ دن ٹھہرے نہیں رہے دس یا بارہ دن ہوٹل میں قیام ہے جہاں گھر کی طرح تمام تر سہولیات دستیاب ہیں آپ کو کوئی فرق نہیں پڑا لیکن اگر کوئی شخص چاہے کہ نماز کی رعایت سفر میں دی گئی تھی اب اس کی ضرورت نہیں ہے میں تو پوری نماز پڑھوں گا امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کی نماز ہی نہیں ہوگی چونکہ اس نے اللہ کی دی ہوئی رخصت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اللہ نے نماز میں رخصت دی ہے کہ سفر میں فرض نماز کی آدھی رکعتیں پڑھ لینا لیکن وہ بڑا طاقتور اور مضبوط بننا چاہتا ہے اللہ کی رخصت کو ٹھکرا رہا ہے۔ یہ اللہ کی نعمت کی ناشکری ہے اس شخص کو اب یہ نماز لوٹانی پڑے گی۔

ہر چند یہ کہ اگر آپ Mortgage نہیں لیتے اور اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو رہ لیں تقویٰ کی نیت پر اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو اجر دے گا۔ اگر آپ اپنے آپ کو بلا وجہ اتنی مشقت اور تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتے اور اپنے آپ کو، اپنی مسلم کمیونٹی کو، ادارہ کو تنظیم کو یا اپنے مشن کو establish کرنا چاہتے ہیں تو اللہ نے آپ کیلئے راستہ کھول دیا ہے۔ آپ اس سہولت سے مستفید ہوں۔ Facility adopt کریں۔

بعض لوگ اس کو مطلقاً حرام کہتے ہیں اور ان ممالک میں بیٹھ کر باقی ساری سہولیات لیے جا رہے ہیں وہ حلال ہو گیا ایکدم Mortgage کا وقت آیا تو وہ حرام ہو گیا۔ اب ان ممالک میں آباد مسلم اقلیت کو جہاں سے تنخواہ مل رہی ہے میڈیکل ٹریٹمنٹ ہو رہا ہے ہر مہینہ دو ڈھائی سو ڈالر چائلڈ بینیفٹ لے رہے ہیں جاب لیس عورت کا الاؤنس لے رہے ہیں میڈیکل، ایجوکیشن الاؤنس لے رہے ہیں ساری زندگی گزارہ کر رہے ہیں ان سے لے لے کر تو جہاں سے لے رہے ہیں ان کے پاس وہ پیسے کہاں سے آئے؟ شراب پر جی ایس ٹی لگا کر، خنزیر بیچ کر، اور ان تمام ذرائع سے آئے جو جائز بھی ہیں اور ناجائز بھی ملے جلے ہیں ان کا سودی نظام ہے وہ بھی سود پر

لین دین کرتے ہیں حکومت کی سرمایہ کاری ہوتی ہے ان کے shares ہوتے ہیں وہ لین دین کا ایک پورا نظام ہوتا ہے۔ جب آپ ساری سہولتیں لیے جا رہے ہیں استعمال کر رہے ہیں تو سارا کچھ حلال ہے ایک جب مکان کیلئے قرض لینے Mortgage کا وقت آتا ہے تو Mortgage کی دم پکڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور وہ حرام ہو جاتی ہے۔ آپ سے پوچھا جائے کہ باقی سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ تو آپ کا جواب ہوگا کہ وہ نہ لیں تو مر جائیں؟ بچوں کے بینیفٹ نہ لیں تو ہم اپنے بچوں کو تعلیم ہی نہیں دلا سکتے سارا مہینہ محنت مزدوری کام کاج کر کے شوہر بیوی عزت و آسودگی کی زندگی بسر نہیں کر سکتے جب تک حکومتی مدد ساتھ نہ ہو۔ بے شمار سہولتیں جو حکومت مفت دیتی ہے اگر وہ سہولتیں نہ ملیں اور ان پر پابندی لگ جائے اور خالی محنت کر کے جو کمائی ہے صرف وہ آپ کو ملے تو میرا نہیں خیال کہ ایک بڑی فیملی اپنی کمائی سے ان غیر مسلم ممالک میں آسودہ زندگی گزار سکے۔ اب اگر آپ کو اتنا فکر ہے تو آپ عالم کفر میں تشریف کیوں لے گئے۔ جائیں عالم اسلام میں مکہ پاک اور مدینہ طیبہ بغداد شریف میں رہیں۔

کیا صحابہ کرامؓ تابعین تبع تابعین مکہ پاک مدینہ طیبہ چھوڑ کر غیر اسلامی دنیا میں immigration کر کے جاتے تھے؟ آپ کیوں گئے ہیں آپ کو چاہئے کہ اپنے ملک میں رہیں اور محنت مزدوری کر کے حلال کھائیں جس کو میں سمجھا رہا ہوں اس کا جواب ہوگا؟ کہ نہیں یہاں مجبوری ہے اگر سہولتیں نہ لیں تو گزر اوقات ہی نہیں ہو سکتا تو اس پر سوال یہ ہے کہ اگر آپ Mortgage نہ لیں تو کتنے فیصد مسلمان ہیں جو 100% طریقہ سے paid off اپنا مکان خرید سکتے ہیں۔ Mortgage کے بغیر؟ کینیڈا وغیرہ میں ایک ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا چھوٹا سا مکان بھی نہیں لے سکتے۔ اتنے ڈالرز کس کی جیب میں ہیں؟ اگر اتنی رقم جیب میں ہو تو وہ تکلیف کر کے کینیڈا میں کیا لینے گیا ہے وہ پاکستان میں بیٹھا پچاس ساٹھ لاکھ روپے پاکستان میں ہوں تو وہ وطن، رشتہ داروں اور

قبر کی زمین چھوڑ کر کیوں جائے گا؟ اپنے ملک میں رہ کر وہ عزت و آسودگی کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اسے کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ساری بات یہ ہے کہ جب آپ باقی سہولیات لے رہے ہیں تو ان میں Mortgage کو بھی شامل کر لیں۔ یہ بھی ایک سہولت ہے۔ اس پر ایک اور نقطہ سمجھاتا ہوں۔ یہ تو تھا جو کچھ آپ لے رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سود صرف لینا ہی حرام نہیں ہے دینا بھی حرام ہے کفر کے نظام سے لینا بھی حرام اور اس کو دے کر طاقت پہنچانا بھی حرام ہے۔ اگر آپ Mortgage کی سہولت نہیں لینا چاہتے لیکن آپ ٹیکس دیتے ہیں آپ کے ٹیکس سے اسلام کی حکومت طاقتور ہو رہی ہے یا کفر کی؟ اسلام دشمن طاقتوں کو اس پیسہ سے طاقت پہنچا کر ان کی خدمت کر رہے ہیں؟ یا اسلام کی یا ان کے نظام کی کر رہے ہیں۔ آپ ٹیکس بھی ان کو دے رہے ہیں نوکری بھی ان کی کر رہے ہیں ان کو ٹیکس جی ایس ٹی بھی دے رہے ہیں۔ سارے معاملات کا لینا بھی چل رہا ہے دینا بھی۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ سارا لین بھی حلال اور سارا دین بھی حلال اس میں ایک بات Mortgage کو نکال کر یہ حرام ہے سود ہے۔ پھر آپ پنشن وغیرہ سب کچھ چھوڑ دیں۔ وہ آپ کو سب چیزوں میں سود ملا کر دے رہے ہیں یہ میں نے آپ کو جملہ معترضہ کے طور پر نقطہ سمجھایا۔

اب ہم آتے ہیں Mortgage کی شرعی حیثیت کی طرف۔ تو شریعت کہتی ہے کہ جب مسلمان ایسی حالت میں ایسی جگہ پر رہ رہے ہوں جہاں اسلام کے قوانین اور احکام نافذ ہی نہیں اور عالم کفر کی حکومت ہے تو وہاں اگر آپ اپنے معاش، رہائش، سہولت، گزر اوقات اور کاروبار بہتر بنانے کیلئے جب آپ ان کو ٹیکس کی صورت میں دے رہے ہیں تو وہاں جو نظام available ہے میں شہری کے طور پر آپ کا ان سے ان سہولیات کا لینا بھی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ سود حرام ہے حلال نہیں ہو جائیگا۔ مگر اس کے حکم کا نفاذ نہیں ہوگا۔ عالم کفر ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں قانون آپ کے ہاتھ

میں نہیں انفرادی قرضوں کے لین دین کا نظام ہی نہیں اگر ایک نے کسی جگہ سے لے لیا تو کون واپس کرے گا یہ نظام ہی نہیں ہے اور لوگوں کے پاس اتنی گنجائش بھی نہیں ہے۔ جس کی تھوڑی بہت گنجائش ہے وہ تھوڑی خدمت کر دیتا ہے مسجد دین و مشن کی۔

یہاں چونکہ احکام نافذ نہیں ہیں عالم کفر ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں لہٰذا آپ کی حالت استثنائی exceptional کی ہوگی۔ دار الکفر میں مسلمانوں کا کیس آرڈنری نہیں exceptional case ہوگا۔ Being a minority in un Islamic society اقلیت ہونے کی وجہ سے نظام آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے یہ استثناء ہے اور اللہ پاک نے استثنائی حالات میں ضرورت پورا کرنے کیلئے حرام کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ میں من وعن اضطراری حالت یہاں نافذ نہیں کر رہا۔ میں اس کا اطلاق نہیں کر رہا۔ میں اسلام کا اصول سمجھا رہا ہوں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے اور جان بچانے کیلئے Mortgage لے لیں۔ ایسا نہیں ہے میں ایک اسلام کا پرنسپل سمجھانا چاہتا ہوں کہ اسلام نے exception کی کیا کیا شکلیں رکھی ہیں۔ خنزیر حرام، مردار حرام، شراب حرام اور تمام حرام جانور جن کو قرآن وحدیث نے حرام declare کر دیا ہے تو آپ کو کھانے کا نہیں ملا سفر میں ہیں کسی جگہ پر ہیں بھوک ہے جان کا خطرہ ہے مرنے کا ڈر ہے اگر خنزیر اور شراب ہی دستیاب ہے اور حلال رزق دستیاب نہیں ہے تو اسے کھا پی کر جان بچانا فرض ہے تو آپ حرام چیز بھی بقدر ضرورت کھا کر استعمال کر کے جان بچا سکتے ہیں اور قرآن نے کہا فلا اثم علیہ.........

آپ پر گناہ نہیں ہوگا۔ اس استثنائی حکم سے نہ تو خنزیر حلال ہو گیا ہے نہ مردار حلال ہو گیا؟ اور شراب پر بھی چونکہ اس حکم کا اطلاق ہوتا جس کی حرمت حدیث میں آئی ہے حرام اپنی جگہ حرام ہے مگر ہوا کیا؟ جب صورتِ حال تبدیل ہو گئی اور Present state of necessity آ گئی۔ extreme state of necessity under

under pressing state of ۔ آ گئی change of cirmcumstances necessity under exceptional condition وہ جو حرام ہونے کا حکم تھا معطل ہو گیا۔ حکم معطل ہونے سے کچھ وقت کیلئے اس پر عملدر آمد معطل ہو گیا ہے۔

اگر کسی کے پیسے اور وسائل حرام ہیں اور وہ آدمی حج کرنے جاتا ہے تو حج ہو گا یا نہیں ہوگا؟ تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ اس کو حرام کمانے کا گناہ اپنی جگہ حرام خرچ کرنے کا گناہ اپنی جگہ مگر even then حج ہو جائے گا۔ حج کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اس کے ذمہ جو فرضیت حج تھی وہ برقرار نہیں رہے گی۔ حج نہ کرنے کا سوال اس سے نہیں کیا جائے گا اور وہ جو حرام کمایا اس کی جگہ سزا الگ بھگتے گا۔ آپ نے دیکھا کہ استثنیٰ کر دیا۔ مال حرام تھا مگر حج اللہ پاک نے کرا دیا مسلمانوں کو اتنی تکلیف میں نہیں ڈالا کہ تمہارا حج بھی گیا مال بھی گیا۔ اس طرح کے مختلف احکام ہیں۔

استثنائی حالات میں اجازت دے دی جاتی ہے۔ میں اب یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ Mortgage حرام کھا کر جان بچانے کے برابر ہے۔ نہیں وہ تھی انفرادی ضرورت Individual status necessity یہ ہے اجتماعی اضطراب وہاں جان بچانے کا مسئلہ تھا یہاں پہ رہنے اور settle ہونے کا مسئلہ۔

شریعت نے exeptional صورت میں آپ کو مستثنیٰ کر دیا۔ یہاں اب اجتماعیت collectivity کا مسئلہ ہے۔ یہاں اگر آپ mortgage نہیں لیتے تو کوئی شخص مکان نہیں خرید سکتا قابل رہائش ہی نہیں پھر کیا کرے گا کرائے پر مکان لے گا؟ اگر کرائے پر مکان لے گا اور کاروبار بھی نہیں کر سکتا کیونکہ mortgage نہیں لے سکتا تو موجودہ available وسائل سے کاروبار کرے گا محدود نوکری کرے گا۔ اس میں سے مکان کا کرایہ بچوں کی تعلیم دیگر اخراجات کھانا پینا وہ survive ہی نہیں کر سکتا۔

یہاں collective muslim society کے sruvival کا مسئلہ ہے۔

وہاں individual life کا survival تھا۔ اس لیے اس میں exception تھا۔ یہاں collective society کے اکنامک survival کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ بحیثیت مسلمان سوسائٹی طے کر لیں کہ ہم mortgage نہیں لیں گے نہ کروبار نہ ضروریات کیلئے۔ بچوں کی تعلیم نہ مکان کیلئے۔ ساری سہولیات بند closed کر دیں گے۔ صرف جو کمائیں گے سارا خرچ اسی میں سے کریں گے۔ اگر یہ شروع کر دیں تو ساری کی ساری سوسائٹی انکا یہاں survival مشکل بلکہ 80%، 90% کا survival ناممکن ہو جائے گا اور 10% کا نہایت مشکل ہو جائے گا۔ آپ کا گزر اوقات ہی ممکن نہیں ہے۔

یہ حالت اضطراب ہے۔ جان بچانے کا مسئلہ نہیں اجتماعی طور پر مسلمانوں کا قیام بچانے کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ آج تمام mortgage بند کر دیں اور آپ کے وسائل ہی نہ ہوں خالص اپنی کمائی سے کسی کی ہزار ہا ڈالر کی بچت ہوتی ہے جب نہیں ہوتی وہاں لوگ مسجدیں بناتے ہیں یہ کن لوگوں نے بنائی ہیں؟ جن لوگوں کے پاس چار پیسے بچت کے ہیں وہی دیکر اللہ کے گھر بنا رہے ہیں۔ اب امریکہ، نارتھ امریکہ، U.K میں اتنی مسجدیں بن گئی ہیں اس پر تو فخر ہو رہا ہے کہ اتنے اللہ کے گھر بن گئے ہیں یہ فخر کرنے والے مسجدیں بنانے پر تو خوش ہیں اور mortgage کو حرام کر رہے ہیں ان سے پوچھو کہ مسجدوں کو بنانے کیلئے جو لوگ پیسے دے رہے ہیں وہ لوگ کہاں سے لا رہے ہیں اگر آج ان کا mortgage بند ہو جائے۔ 90 اور 98% لوگ یہاں رہنے والے قابل ہی نہ رہیں کہ وہ دو، چار، دس ہزار روپے بھی کوئی مسجد کیلئے جگہ خریدنے یا تعمیر کرنے کیلئے دے دیں۔ مسجدوں کا قیام، دینی مدرسے، اسلامک اسکول، اسلامک ایجوکیشن، اسلامک سوسائٹی اور مسلمان بحیثیت کمیونٹی کمزور پڑ جائیں گے اور بالآخر ختم ہو جائیں گے۔

پوری دنیا پر مغربی دنیا میں رہنے والے مسلمان کروڑوں اربوں خرچ کر کے اسلام کی بہار لا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معیشت میں مضبوط ہوتے ہیں۔ اور مضبوط اس لیے ہو رہے ہیں کہ انہوں نے سہولتوں facilities کا راستہ اپنے اوپر کھول رکھا ہے۔ اگر آج یہ سہولیات کا راستہ بند ہو جائے تو نہ ویسٹرن ورلڈ میں کوئی مسلمان فیکٹری چلا سکتا ہے نہ انڈسٹری لگا سکتا ہے نہ ٹریڈ تجارت کر سکتا ہے نہ بڑی مارکیٹ میں جا سکتا ہے۔ اگر ایسی حالت میں یہاں رہنا ہے بھوکے ننگے تو اسلام کی بدنامی کیوں کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں فقیر ہوتے ہیں مانگتے ہیں یہ جو اسلام کی خدمت تبلیغ ہو رہی ہے اسلام کے ادارے تشکیل پا رہے ہیں پورے عالم اسلام میں جہاں مشکل آتی ہے بڑھ چڑھ کر امداد مغربی دنیا میں رہنے والے مسلمان کرتے ہیں ان اعمال کی تعریف تو ہوتی ہے۔ سب تعریف کرتے ہیں مبارکبادیاں دیتے ہیں خوش ہوتے ہیں وہ اگر مالی طور پر آسودہ نہیں ہوں گے تو یہاں کی سوسائٹی میں اسلام کو (buildup) تعمیر نو کیسے کریں گے۔ باعزت مقام مسلمانوں کو کیسے ملے گا۔ Respectful participation نہیں رہتی اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ economically مضبوط ہوں۔ معاشی واقتصادی طور پر مضبوط ہونا اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک موجودہ تمام سہولیات کا فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

اس لیے غیر مسلم ممالک میں اس کی حرمت کا حکم نفاذ suspend ہوگا۔ حرمت رباء میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی مگر غیر اسلامی ممالک میں اس کی enforcement نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ دارالکفر کی زمین ہے۔

ایک بات اور بتا دوں مثلاً اگر کوئی مسلمان وہاں قتل کر دے تو کیا اس ملک میں اس پر قصاص کا قانون نافذ ہوگا؟ کوئی اور گناہ کرے جس پر حد ہے اس پر حد لاگو ہوگی؟ گناہ ہے تو واجب الحد اسلام میں تو اس کی سزا ہے لیکن اس کا دارالکفر میں

نہیں ہوگا۔ اگر کوئی مسلمان دارالکفر میں چلا جائے تو وہاں کے قوانین کے مطابق treat ہوگا۔ بعض احکام ایسے آئے ہیں فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ قاضی کا رائٹ ہے اسلامک state کے ہیڈ سربراہ کا حق ہے وہ enforce کرے اگر وہ نہ ہو تو وہ احکام اس دور میں بھی معطل ہو جاتے ہیں۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کے دور میں ایک شخص نے چوری کی۔ دورِ خلافت راشدہ میں اس نے اپنے مالک کا اونٹ چرا لیا۔ مالک نے عدالت میں case کرایا فائنل فیصلہ سپریم کورٹ میں ہوا۔

اس زمانے میں executive or judiciary ایک ہوتی تھی۔ چوری ثابت ہوگئی۔ آپؓ نے چوری کی سزا جو قرآن نے دی تھی حد کا حکم جاری فرمادیا۔ جب حد کی سزا ہوگئی تو اس شخص نے حضرت عمر فاروقؓ کی عدالت میں review petition داخل کی نظر ثانی کی اپیل کی۔ آپ نے اس کی اپیل کی سماعت سنی۔ اس نے پیش ہو کر کہا کہ حق ہے کہ میں نے چوری بھی کی جرم ثابت ہوا آپ کی سزا بھی حق ہے مگر میری درخواست یہ ہے کہ میرے مالک کو بلا کر پوچھئے کہ اس نے کتنے مہینوں سے مجھے تنخواہ نہیں دی تھی؟ میرے پاس وسائل نہیں تھے میں چوری نہ کرتا تو کھاتا کہاں سے۔ آپؓ نے اس کے مالک کو بلایا۔ اس سے پوچھا کہ تم نے کچھ مہینوں سے اس کو تنخواہ نہیں دی تھی۔ اس نے اعتراف کیا۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ تنخواہ بند ہو گئی تھی اس کی آپؓ نے چوری کی سزا کا حکم منسوخ کر دیا اور بجائے اس چور کو سزا دینے کہ مالک کو جس کی چوری ہوئی تھی اس کو دوگنا جرمانہ کر دیا اور فرمایا جب تم اس کو چوری سے بے نیاز نہیں کرو گے اس کی ضرورت پوری کرنے کیلئے وسائل فراہم نہیں کرو گے تو ان حالات میں جب وسائل میسر نہ ہوں تو چوری پر سزا کا حق کسی حکومت کو نہیں کہ وہ نافذ کرے اس لئے یہ سیدنا فاروق اعظمؓ کی سنت ہے۔

شریعت کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر کسی ملک میں اتنا قحط آجائے کہ اس قحط

میں پوری سوسائٹی مبتلا ہو جائے اور قحط زدہ لوگ اگر چوری کر لیں اور یہ ثابت ہو جائے تو ان پر حد نفاذ ہو جائے گی۔ حد کی سزا جاری نہیں ہوگی۔ قحط کی حالت میں اسلام کی حد suspend ہو جاتی ہے۔ قرآن کی حد معطل ہو جاتی ہے۔ یہ suspension of law ہے تو جب صورتحال تبدیل ہو جاتی تو اس میں احکام کا نفاذ according to situation ہوتا ہے۔

شریعت و فقہ کا ایک طریقہ ہے کہ جب زمانہ اور حالات بدل جائیں تو احکام تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تغیر الاحکام بالتغیر الزمان فقہ و شریعت کا ایک آفاقی و متفقہ اصول (universal principle) ہے کہ جب حالات بدل جائیں تو بدلے ہوئے حالات میں احکام بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جب مسلمان غیر مسلم ممالک میں اقلیت بن کر چلے گئے تو حالات تبدیل ہو گئے جب تک وہ یہاں ہیں ان حالات میں چونکہ نافذ کرنے والی حکومت ہی نہیں ہے اور کوئی متبادل سسٹم بھی نہیں ہے ان حالات میں یہاں حکم کا نفاذ بدل جائے گا۔ یہ ایک بڑا بنیادی اور پرائمری فنکشن ہے۔ اس کی بے شمار اور مثالیں اور بہت سارے اصول ہیں۔

لہٰذا خلاصہ یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کا اپنی رہائش اور کاروباری ضرورت کا پورا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ان کی ضرورت پوری ہونے اور مضبوط ہونے سے اسلامک سوسائٹی اور مسلم کمیونٹی مضبوط ہوگی اور جب مسلمان بحیثیت مجموعی مضبوط ہوں گے تو مسلمانوں کی مضبوطی اور استحکام سے اسلام مضبوط ہوگا۔ اسلام کے ادارے مضبوط ہوں گے۔ اسلامی تعلیم و تربیت کا نظام مضبوط ہوگا۔ اسلام کو مضبوطی طاقت ملے گی اور امت مسلمہ کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ لہٰذا امت مسلمہ اپنی مدد کیلئے وہاں کی مسلم کمیونٹی کو عالم کفر میں رہتے ہوئے کمزور نہ رکھنا اور مضبوط کرنا اس کی خاطر mortgage facility سے فائدہ اٹھانا استثنائی رخصت کے تحت ہے اور وہاں

احکام کا نفاذ نہیں ہوگا۔ آپ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے آگے ڈاکٹر صاحب کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کا شرعی طریقہ بتاتے ہیں۔

فقہ کی ہر کتاب چار مصادر شریعہ کو بیان کرتی ہے۔ شریعت اسلامیہ کے ماخذ قرآن، سنہ، اجماع اور قیاس ہیں۔ اگر اس کی تفصیل میں جائیں گے تو اجتہاد اجماع سے شروع ہو جاتا ہے اجماع تغیر زمان احکام کے تغیر تک 14 صورتیں ہیں جن میں سات اقسام ہیں اور سات ہی صورتیں ہیں جو اسی کی Forms ہیں یہ سب اجتہاد کے ذیل میں آتے ہیں ان کو ذیلی ماخذ subsidery sources کہیں گے۔ پرائمری ماخذ دو قرآن وسنت ہیں۔ سیکنڈری ماخذ اجماع اور قیاس ہیں جبکہ ذیلی ماخذ اجماع اور قیاس کو ملا کر 14 ورنہ بارہ بچ جائیں گے۔ اسلامک لاء کے کل ماخذ سولہ بن جاتے ہیں۔ اگر کوئی قرآن وسنت کا متن (Text) ڈیمانڈ کر دے یعنی کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دے اس میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک ہے طلب واختیار اور ایک ہے اختیار واباحت اور ایک ہے اعلان واستقرار اسلامی حکم ان تین درجہ وتین چیزوں میں سے کسی ایک پر مشتمل ہوگا۔ یہ اصولی بات ہے اسلامی حکم کیلئے لازمی ہے اس میں کسی چیز کی طلب پائی جائے گی۔ اگر وہ طلب expressive ہو تو ہم کہیں گے کہ expressive of demand positive or negative ڈیمانڈ میں کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم ہوگا۔ اگر کرنے کا حکم ہو تو ان گیارہ مدارج میں سے کسی میں fall کرے گا۔ پانچ act of commision اور پانچ act of omission اور ایک دونوں میں مشترک ہے اگر کرنے کی ڈیمانڈ ہوگی تو مزید gravity کو verifiy کرنا ہوگا کہ ڈیمانڈ کرنے کا حکم کیا ہے؟ اس ڈیمانڈ کی legal or jurictic strength کیا ہے یعنی کس سطح کے حکم کی نص سے ثابت ہے قرآن سے یا سنت سے اگر قرآن سے ثابت ہے تو کیا expressive ہے اگر قرآن سے ثابت ہے تو یا

employed ہے real sense ہے یا mataforical ہے یا evident ہے۔
شرعی ہے یا کنایہ ہے حقیقت ہے یا مجاز ہے، براہ راست ہے یا بالواسطہ، اس طرح
حدیث میں بہت ساری چیزیں ہیں حدیث میں دیکھیں گے کہ متواتر ہے یا براہ
راست ہے یا بالواسطہ، اس طرح حدیث میں بہت ساری چیزیں ہیں حدیث میں
دیکھیں گے کہ متواتر ہے یا مشہور ہے، عزیز ہے یا غریب ہے حتیٰ کہ ضعیف سے بھی
احکام ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اگر حدیث ضعیف ہے یہ بھی ایک ٹرینڈ طریقہ ہے کہ یہ
حدیث ضعیف ہے ہم نہیں مانتے۔ معاذ اللہ استغفر اللہ۔ ضعیف حدیثیں موضوع نہیں
ہوتیں کہ ان کو رد کر دیا جائے یا وہ باطل ہو جائیں۔ ضعیف حدیث بھی حدیث ہوتی
ہے مگر اس کے اثبات میں کوئی ٹیکنکل خلاء ہوتا ہے۔ روایت میں کسی ایک ٹیکنکل
کمزوری کی وجہ سے حدیث ضعیف ہو جاتی ہے اس سے فرض اور واجب ثابت نہیں
ہوتے یا بنیادی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے مستحباب اور جواز ثابت ہو سکتے ہیں اور
اس حدیث سے فروع اور فضائل ثابت ہو جاتے ہیں ان کو مانا جاتا ہے یعنی ہر چیز کے
آگے مدارج ہیں یہ ایک پوری سائنس ہے تو اگر کرنے کی طلب ہوگی تو پھر دیکھیں
گے کہ جو کرنے کا حکم ہے وہ فرض کے درجے میں ہے یا واجب کے سنت موکدہ یا سنت
غیر موکدہ یا مستحب۔ ان پانچ گریڈ یا اسکیل میں وہ حکم طلب آئیگا۔ اگر طلب حکم میں نہ
کرنے کی ہوگی act of ommision تو پھر وہ ادھر حرام میں یا مکروہ تحریمی میں یا
اساءت میں مکروہ تنزیہی میں یا خلاف اولیٰ میں ان میں بھی ان پانچ گریڈ یا اسکیل
میں fall کرے گی۔ یہ دس چیزیں آجائیں گی طلب میں اب حکم کی دوسری صورت
اختیار یا اباحت ہے یعنی شریعت کا جو حکم ہے اس میں کوئی طلب نہیں یعنی نہ کسی کام
کے کرنے کا حکم اور نہ کسی کام کے کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اب یہاں جو مغالطہ پایا
جاتا ہے بالعموم Islamic legal science سے پوری واقفیت نہ ہونے کے

باعث بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس شریعت میں جس چیز کے کرنے کا حکم نہیں ملا وہ ناجائز ہے؟ یعنی آپ نے کوئی کام کیا اور میں آپ سے پوچھوں کہ اس کی سند کہاں ہے۔ قرآن یا حدیث کا کوئی حکم موجود نہ ہوتو مجھے یہ اجازت نہیں کہ میں اسے ناجائز کہوں۔ قرآن وحدیث میں کسی چیز کے کرنے کے حکم کا نہ ہونا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ طلب فعل میں طلب امر میں fall نہیں کرتا۔ لیکن اس سے ناجائز ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوگا۔ ناجائز ثابت کرنے کیلئے بالکل اس طرح دیکھنا پڑے گا کیا قرآن وحدیث میں اس کی منع بھی آئی ہے؟ جیسے طلب فعل کے بغیر ہم اس کو فرض سے لیکر مستحب میں نہیں ڈال سکتے بغیر ثبوت بالکل اس طرح نہیں اور منع کی ثبوت کے بغیر شریعت میں ناجائز نہیں کہتے۔ بالکل اس طرح نہیں اور منع کے ثبوت کے بغیر شریعت میں ناجائز نہیں کہتے حکم اور ناجائز کیلئے ہمیں واضح ثبوت چاہیے اب آجاتی ہے اگلی category آپ ایک کام کر رہے ہیں اور اس کے نہ تو کرنے کا حکم ملتا ہے قرآن وحدیث میں اور نہ، نہ کرنے کا اس کے منع اور حرام ہونے پر کوئی نص ثابت نہیں۔ قرآن وسنت سے اب یہ کہاں Fall کرے گا اس کو ہم مباح کہیں گے۔

رؤیت ہلال کے مسئلے کا فقہی جائزہ

ہر سال عیدین کے موقع پر رویت ہلال کے مسئلہ پر مسلمان ممالک اختلافات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مسلم ممالک کے جغرافیائی تنوع کے باعث اوقات کار کا اختلاف تو رہا ایک طرف لیکن ایک مسلم ملک میں رہنے والے مسلمان کا تین تین عیدیں کرنا جہاں مسلمان عوام الناس کے اضطراب کا باعث بنتا ہے وہاں مسلم ممالک میں بسنے والے سیکولر اور دین بیزار طبقے کی اسلام پر انگشت زنی کا جواز بھی فراہم کرتا ہے اور یہود ونصاریٰ تو خیر مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہی ہیں۔

دسمبر 2007ء کو میں انگلینڈ میں تبلیغی دورے پر تھا۔ عید الاضحیٰ کی نماز میں نے لندن میں برنٹ کی جامع مسجد میں پڑھائی۔ تماشا یہ تھا کہ انگلینڈ میں تین دن عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی جاتی رہی یعنی کچھ مسلمانوں نے سعودی عرب کے ساتھ عید منائی، کچھ نے پاکستان کے ساتھ عید منائی اور کچھ نے دیگر مسلم ممالک کے ساتھ عید منائی۔ میں نے جس مسجد میں نماز عید پڑھائی وہاں دوسرے دن جمعۃ المبارک کے بعد انتظامیہ کے ایک فرد نے اٹھ کر کہا کہ جو کوئی شخص سوال کرنا چاہے وہ نماز کے بعد خطیب صاحب سے سوال کرسکتا ہے۔ چنانچہ احباب نے جو سوالات کیئے وہ بھی رویت ھلال کے مسئلہ پر تھے۔ خاص طور پر ایک افریقی مسلمان نے جس کے ساتھ اس کی چھوٹی بیٹی بھی تھی بڑے کرب کے ساتھ سوال پوچھا کہ میں بہت سے علمائے کرام سے پوچھ چکا ہوں کہ مسلمان ایک ہی دن عید کیوں نہیں مناتے۔ میں نے اس کو بتایا یہ مسئلہ صرف مذہبی ہی نہیں بلکہ اس میں بہت سے سیاسی، سفارتی، مسلکی اور تمدنی عوامل بھی کارفرما ہیں کہ مسلمان خلافت

کے ادارے کے ٹوٹنے کے بعد کسی بھی مسئلہ پر اپنی وحدت کا اظہار نہیں کر سکے۔

ایک رائے یہ بھی تھی کہ سارے مسلمان ممالک سعودی عرب کو follow کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ سعودی حکومت از خود بہت سے معاملات میں تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنے کیلئے تیار نہیں۔

اکتوبر 2007ء کی عید الفطر کی نماز چونکہ میں نے امریکہ کی ریاست نیویارک میں پڑھائی تھی اور میں وہاں دیکھتا رہا کہ وہاں تمام مسلمانوں نے ایک دن عید منانے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود کچھ نے سعودی عرب کے ساتھ منائی اور کچھ نے پاکستان کے ساتھ منائی۔ میں نے رویت ھلال کے مسئلہ پر مضامین و کتب کا مطالعہ کیا تو رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے چیئرمین نامور اسکالر مفتی منیب الرحمٰن صاحب کی رائے مجھے سب سے مناسب نظر آئی۔

آپ سے برطانیہ کے ایک عالم دین نے رویت ہلال کے متعلقہ چند سوالات پوچھے جن کے آپ نے بڑی شرح وسبط کے جوابات ارشاد فرمائے۔ میں ذیل میں انہی کے رشحات قلم قارئین کی اس مسئلہ پر علمی تشنگی بجھائے کیلئے سینۂ قرطاس پر قلمبند کر رہا ہوں۔

قرآن وحدیث میں چاند کے بارے میں جو نصوص ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند ساکن اور جامد نہیں ہے بلکہ متحرک ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ (الرحمٰن:5)

"سورج اور چاند (اپنی گردش میں) ایک حساب اور ضابطے کے پابند ہیں"۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝۳۸ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝۳۹ لَا الشَّمْسُ يَنۢبَغِي لَهَآ أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ

سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۝ (یٰسین)

''اور سورج اپنی قرارگاہ (محور و مدار) پر رواں دواں ہے، یہ ایک غالب علیم ہستی کا طے کردہ (نظام) ہے، اور چاند کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، یہاں تک کہ لوٹ پھر کر وہ کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے، نہ سورج کی مجال کہ وہ (چلتے چلتے) چاند کو جا پکڑے، اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے، اور ہر ایک (اپنے) مدار میں تیر رہا ہے۔''

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ (ابراہیم:33)

''اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مطیع کر دیا کہ وہ مسلسل رواں دواں رہیں۔''

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند اللہ تعالیٰ کے حکم سے متحرک ہے، اس کا مدار، محور اور منزلیں مقرر ہیں، اس کا یہ سفر خودسری کا نہیں ہے اور نہ ہی بے ہنگم ہے، بلکہ ایک سسٹم، ڈسپلن کا نظام کے تابع ہے۔

یہ آیات مبارکہ آیاتِ تشریع تو نہیں بلکہ آیاتِ تکوین اور تذکیر موعظت ہیں، لیکن بہرکیف ان سے یہ منشائے ربانی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ چاند کا محور و مدار، حرکت و رفتار اور منازل قادر مطلق کی جانب سے متعین ہیں اور اس تقدیر الٰہی سے کسی کو سرمو انحراف کی مجال نہیں ہے۔ اور موجودہ دور میں سائنسی علوم اور آلات کے ذریعے انسان نے یقین یا کم از کم ظنِ غالب کی حد تک اس علم کو حاصل کر لیا ہے اور فقہاءِ اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ مسائل و احکام شرعیہ کے استنباط و اخراج اور اطلاق میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کی آراء سے استفادہ کرنا چاہئے، اس کی دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) فقہائے احناف نے اس مسئلہ پر امکانی بحث کی ہے کہ احلیل ذکر سے پانی یا

مائع داخل کر دیا جائے تو روزہ فاسد ہو گا یا نہیں؟ امام اعظم ابو حنیفہ کا قول یہ ہے کہ روزہ فاسد نہیں ہو گا، امام ابو یوسف کا قول یہ ہے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا اور امام محمد مضطرب الخیال ہیں یعنی کوئی حتمی اور قطعی رائے قائم نہیں کر پائے، یہ اختلاف اس امر پر مبنی ہے کہ آیا ''احلیلِ ذکر'' اور جوفِ معدہ کے درمیان منفذ (یعنی کوئی روٹ یا نالی) ہے یا نہیں۔

امامِ اعظم کا خیال یہ تھا کہ منفذ نہیں بلکہ درمیان میں مثانہ ہے اور پیشاب اس سے مترشح ہو کر آتا ہے اور امام ابو یوسف کا خیال تھا کہ منفذ ہے اور ان دونوں ائمہ کا اس مسئلے میں اختلاف (یعنی ایک کے نزدیک اس عمل سے روزے کا نہ ٹوٹنا اور دوسرے کے نزدیک ٹوٹ جانا) اسی اختلاف پر مبنی ہے۔ امام محمد نے پہلے امام اعظم کے قول سے اتفاق کیا، پھر امام ابو یوسف کے قول کی جانب ان کی رائے مائل ہوئی، اور آخر عمر میں توقف فرمالیا، یعنی کوئی قطع رائے قائم نہ کر سکے، کیونکہ اصولی طور پر یہ اختلاف فقہی نہیں ہے، فقہی اصول تینوں ائمہ احناف کے درمیان متفق علیہ ہے، بلکہ یہ مسئلہ ''علم تشریح الاعضاء'' (Anotomy) کا ہے، یعنی ماہرین طب نے طے کرنا ہے۔ اور اس وقت تک ''علم تشریح الاعضاء'' نے اس حد تک ترقی نہیں کی تھی، جس مقام پر آج ہے، (ملخصا البنایہ فی شرح الہدایہ، جلد نمبر ۳، ص ۲۸۵۔ ۲۸۴، دار الفکر۔ بیروت)

(۲) اسی طرح ہمارے قدیم فقہاء کا خیال تھا کہ کان سے جوفِ دماغ تک منفذ ہے، لہٰذا انہوں نے مسئلہ مستنبط کیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، لیکن اب ماہرینِ علم تشریح الاعضاء (Anatomist) نے بتایا کہ کان سے جوفِ معدہ یا دماغ تک کوئی منفذ (Route) نہیں ہے، میں تقریباً تین سال سے اس مسئلے پر اخبارات و رسائل میں لکھ رہا ہوں کہ اس قدیم مسئلے کی تصحیح ہونی چاہئے۔ گزشتہ سال دار العلوم کراچی کے علماء نے الحمدللہ بالاتفاق اسے تسلیم کر لیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ لہٰذا ہمیں ''رویتِ ہلال'' کے مسئلے پر بھی ماہرین موسمیات

وفلکیات کے علم سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے، لیکن اس کی حدود کیا ہوں، یہ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمایئے گا، پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ صریح ارشادات ملاحظہ کیجئے:

لا تصوموا حتی تروا الهلال و لا تفطروا حتی تروه

"جب تک چاند نہ دیکھ لو، روزہ نہ رکھو (یعنی آغازِ رمضان نہ کرو) اور (شوال کا) چاند دیکھے بغیر روزۂ (رمضان) نہ چھوڑو"۔

لا تصوموا حتی تروا الهلال ولاتفطروا حتی تروه فان غم علیکم فاقدروا له

"اور (رمضان کا) چاند دیکھے بغیر روزہ (رمضان) شروع نہ کرو اور (شوال کا) چاند دیکھے بغیر (رمضان کا) روزہ نہ چھوڑو، اگر مطلع ابر آلود ہو (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس کا مہینہ پورا کرو"۔

صوموا لرؤیته وافطروالرؤیته فان غم علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلٰثین

"(رمضان کا چاند) دیکھ کر روزۂ (رمضان) شروع کرو اور (شوال کا) چاند دیکھ کر اختتامِ رمضان کرو، اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کرو، (مشکوٰۃ المصابیح باب رؤیۃ الہلال)۔"

یہ احادیثِ مبارکہ رویتِ ہلال کے بارے میں "تشریعی نصوص" ہیں اور ہم شرعاً ان پر عمل کے مکلّف ہیں، لہٰذا ہر قمری مہینے کا آغاز "رویتِ ہلال" پر ہی مبنی ہوگا، محض ماہرینِ فلکیات کی رائے پر فیصلہ نہیں ہوگا، تاہم "شہادتِ رویت" کے ردّ و قبول میں ان کی رائے سے استفادہ کیا جائے گا، کیونکہ علی الاطلاق کوئی بھی شہادت حجت لازمہ وملزمہ نہیں ہوتی۔

چاند تو مطلع ومدار پر ہر وقت موجود ہے، لیکن قمری ماہ کی 29 تاریخ کو اگلے ماہ کا

چاند نظر آنے یا نہ آنے کے حوالے سے ماہرین فلکیات کے معیارات امکانِ رویت کے اعتبار سے متعین ہیں، قمری مہینے کی 29 تاریخ کو چاند کا ظہور و نمود اگر ہے تو اسے اصطلاحاً پیدائش (Birth) سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ چاند ویسے تو ہمیشہ موجود رہتا ہے، معدوم کبھی نہیں ہوتا، لیکن زیر بحث مسئلہ اس کے مطلع پر ظہور و نمود سے متعلق ہے۔ لیکن بعض اوقات (Birth of moon) کے باوجود امکانِ رویت (Visibility) نہیں ہوتا، اس کیلئے چاند کی عمر، درجہ، غروبِ آفتاب کے بعد اس کی مدتِ حیات، زوایہ وغیرہ، کئی Parameters ہیں۔ ان کی روشنی میں کبھی ''امکانِ رویت'' بالکل نہیں ہوتا، کبھی بالکل نمایاں اور واضح ہوتا ہے اور کبھی خفیف سا ہوتا ہے کہ نظر آ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

میں بحیثیت چیئرمین مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان اور ہمارے اراکین جب امکانِ رویت بالکل نہ ہو اور شہادت آ جائے تو اسے دقتِ نظر سے پرکھتے ہیں اور بالآخر وہ خود ہی رجوع کر لیتا ہے، جب امکانِ رویت خفیف یا خفیف ترین ہو تو بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور الحمدللہ گزشتہ دو سالوں سے پاکستان میں یہ مسئلہ متفقہ طور پر حل ہو رہا ہے اور عیدین یا اعیادِ متعددہ کی روایت دم توڑ رہی ہے، بس اس میں تھوڑی سی استقامت اور عزیمت کی ضرورت ہے۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں گزشتہ پچیس سال سے کسی نہ کسی حیثیت سے ''رویت ہلال'' کے نظام سے متعلق رہا ہوں، ہمیں محکمۂ موسمیات سپارکو اور بعض اوقات نیوی کے ماہرین کی خدمات میسر ہوتی ہیں، لیکن آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ باہر کھلی آنکھ (Naked Eye) چاند نظر نہ آیا ہو اور صرف دوربین سے نظر آیا ہو، چاند جب مطلع پر قابل دید (Visible) ہوتا ہے تو دوربین سے بھی نظر آتا ہے اور کھلی آنکھ سے بھی نظر آتا ہے۔

یو۔کے استفتاء میں جو یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ''رویت'' سے مراد علم ہے اور جب سائنسی یا کسی اور ذریعے سے علم حاصل ہو جائے تو

قضاءِ شرعی کیلئے اس پر اکتفاء کرلیا جائے۔ اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ یہ رائے ''اصولِ دین'' سے ناواقفی پر مبنی ہے۔ اصول فقہ کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کے حقیقی معنیٰ متروک یا متعذر نہ ہوں، اسے حقیقت پر ہی محمول کیا جائے گا اور الحمدللہ! حدیث مبارک ''صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته'' میں ''رویت'' کا حقیقی معنیٰ قرنِ اوّل سے آج تک معمول بہ بھی ہے، اور قابل عمل بھی ہے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی تعذر بھی نہیں ہے، لہٰذا حقیقی معنیٰ سے عدول کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے اور ثبوت رویت کیلئے ''قضاءِ شرعی'' کا مدار رویت پر ہی ہوگا۔

استفتاء واستفسار کا ایک نکتہ یہ ہے کہ رصدگاہوں (Observatories) اور ماہرین فلکیات کے اعتبار سے سعودی عرب کے اعلانات رمضان المبارک اور حج کے بارے میں گزشتہ کئی مواقع پر غلط اور خلاف واقع ہوئے ہیں، یہ بات فی نفسہٖ درست ہے، گزشتہ دو سال سے تو سائنسی اعتبار سے ایسے مواقع بھی آئے کہ پورے عالم میں یا اکثر عالم میں آغازِ رمضان وعید الفطر اور یوم الحج ایک ساتھ متوقع تھا، لیکن اس کے برعکس وہاں سے فیصلے کا اعلان ہوا اور اس پر عملدرآمد بھی ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ''شہادتوں'' کے ردّ وقبول میں احتیاط سے کام نہ لیتے ہوں اور جدید ذرائع علم کو یکسر نظرانداز کردیتے ہوں، ہم ان کی نیت پر تو شبہ نہیں کرتے، کیونکہ ہم ''ظنوا المؤمنين خيراً'' کے مکلّف ہیں۔ تاہم جو شخص، اشخاص اور ادارے بدنیتی یا دانستہ تساہل کا ارتکاب کریں گے تو وہ اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہوں گے۔ لیکن اس فیصلے پر جو عامۃ المسلمین عمل کریں گے، وہ اپنی عبادات کیلئے انشاءاللہ اجر آخرت سے محروم نہیں رہیں گے۔ کیونکہ قضاءِ قاضی اپنی حدود میں نافذ اور مؤثر ہوتی ہے، اور سعودی عرب کی رویت ہلال کمیٹی وہاں کی حکومت کی جانب سے ان کے اپنے ملک کیلئے مامور ہے، پورے عالم اسلام یا عالم پر حکمرانی کیلئے وہ حکومت

خودمختار ومجاز نہیں ہے تو اس کا قائم کردہ ایک ذیلی ادارہ کیسے مجاز ہو سکتا ہے۔ جہاں تک واقع اور حقیقت کے خلاف قضاء قاضی کے مؤثر اور نافذ ہونے کا تعلق ہے تو شیخ الاسلام علامہ برہان الدین المرغینانی لکھتے ہیں:

ومن رأى هلال الفطر وحده ولم يفطر احتياطاً وفى الصوم الاحتياط فى الايجاب

''اور اگر کسی شخص نے تنہا ہلال عید (یعنی شوال کا چاند) دیکھا (اور اس کی شہادت قاضی نے قبول نہیں کی) تو وہ خود بھی احتیاطاً روزہ رکھے اور ہلالِ رمضان میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اتباع امام کو واجب قرار دے۔''

(ہدایہ اولین: ج ۱ ص ۳۹۶ مطبوعہ محمد علی کارخانہ کتب، کراچی)

اور علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(رأى) مكلف (هلال) رمضان او الفطر ورد قوله بدليل شرعى صام مطلقاً وجوباً، وقيل ندباً

''اور اگر ایک عاقل و بالغ مسلمان نے رمضان یا شوال کا چاند دیکھا اور (قاضی نے) دلیل شرعی سے اس کا قول رد کر دیا تو (اتباعِ قاضی میں) اس پر مطلقاً (یعنی ہلال رمضان ہو یا ہلالِ عید) روزہ رکھنا واجب ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ مستحب ہے''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین ہاشمی لکھتے ہیں:

لو صام رائى هلال رمضان واكمل العدة لم يفطر الامع الامام لقوله عليه السلام صومكم يوم يصومون وفطركم يوم يفطرون (رواه الترمذى وغيره).

اگر کسی شخص نے ہلالِ رمضان دیکھ کر رمضان شروع کیا اور اس (کے

روزوں) کی گنتی (تیس) پوری ہوگئی، (مگر امام کے حکم پر ہلالِ عید کا اعلان نہیں ہوا) تو وہ امام کے بغیر تنہا روزۂ رمضان نہ چھوڑے (یعنی عید نہ منائے) کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: جس دن (اتباعِ امام میں) قوم کا روزہ ہو تو تم بھی روزہ رکھو اور جس دن (اتباعِ امام میں) قوم عید منائے اور روزہ چھوڑ دے تو تم بھی ایسا ہی کرو۔''

البتہ علامہ شامی نے بدائع الصنائع کے حوالے سے لکھا ہے کہ علماء محققین کا قول یہ ہے کہ اپنے مشاہدے کے برعکس امام کی اتباع واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، آگے چل کر ''مبسوط'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بصورتِ رمضان واجب ہے اور بصورتِ عید اتباع امام مستحب ہے۔

(ردالمختار: ج ۳ ص ۳۱۵۔ ۳۱۴ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)

جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے، اس میں خطاءِ اجتہادی پر مبنی قاضی کا ہر فیصلہ ظاہراً نافذ تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ فیصلہ حقیقتِ واقعہ کو تبدیل نہیں کرتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

انکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض فاقضٰی له علٰی نحو مما اسمع منه فمن قطعت له من حق اخیه شیأً فانما اقطع له به قطعة من النار

''تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے کے بہ نسبت زیادہ مؤثر دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی مہارت رکھتا ہو اور اس سماعت کے اعتبار سے (بالفرض) میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، تو جس شخص کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے (خلاف حقیقت) کچھ دے دوں تو (وہ چیز اس کیلئے جائز نہیں بلکہ اسے سمجھنا چاہئے کہ) میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں'' (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۳۵۹)۔

اب ہم اس تفصیلی اور مدلل بحث کے بعد آپ کے سوالات کا ترتیب وار جواب خلاصہ کلام کے طور پر دے رہے ہیں اس میں بعض امور کا تکرار ناگزیر ہے اس لیے اس سے طبیعت پر بار محسوس نہیں کیجئے گا۔

۱۔ سعودی عرب کا اعلان رویت مملکت سعودی عرب میں نافذ العمل ہے، دوسرے ممالک ان کی رویت کا تحقیقی جائزہ لے کر کہ آیا ان کا فیصلہ شرعی قواعد وضوابط کے مطابق ان کیلئے قابل قبول ہے یا نہیں، ان کے فیصلہ کو قبول یا رد کر سکتے ہیں۔

۲۔ آبزرویٹری کی وہ معلومات جو بدیہی ہیں، ان سے رویتِ ہلال میں استفادہ ممکن ہے۔ اگر چاند افق پر موجود ہو اور چاند نظر نہ آئے تو فیصلہ حساب پر نہیں بلکہ رویت پر ہوگا۔ تاہم چاند افق پر موجود نہ ہو اور رویت کی شہادت آجائے تو اس پر دقت نظر سے غور کرنا چاہئے، کیونکہ اس صورت میں آنکھیں بند کر کے شہادت قبول کرنے سے امتِ مسلمہ کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ پاکستان کی رویت ہلال کمیٹی اس شہادت کو قبول نہیں کرتی جو واقع کے خلاف ہو، یعنی چاند افق پر موجود ہی نہ ہو اور رویت کی شہادت آجائے تو اس شہادت کو قاضی کے شرح صدر کے منافی سمجھ کر تسلیم نہیں کیا جاتا، کیونکہ کوئی بھی شہادت علی الاطلاق حجت لازمہ وملزمہ نہیں ہوتی۔ چاند کا نظر نہ آنا اگر بہت مشکل ہو لیکن موجود ہو تو اس وقت شہادتوں پر فنی قواعد کی روشنی میں بھرپور جرح سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ آیا واقعی دعویٰ کرنے والے نے چاند دیکھا ہے یا اس کو سہو ہوا ہے (سہو کی نظیریں آثار صحابہ میں موجود ہیں)، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے چاند دیکھا ہے تو اس کو پھر تسلیم کیا جاتا ہے ورنہ نہیں۔ سوال کے دوسرے حصے کے بارے میں اتنا کافی ہے کہ اگر پہلے

سوال کا جواب معلوم ہو تو اس سے فائدہ اٹھا کر نہ تو اس مسلمان ملک کے ساتھ الجھے، نہ ہی ان کا فیصلہ اپنے اوپر لاگو کرنا ضروری ہے۔

۳۔ یہ تجویز ہرگز قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ شرعاً رات غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے، اس لیے جو چاند غروب آفتاب سے پہلے دیکھے وہ معتبر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ چاند کے نظر آنے کیلئے Birth of moon کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کی اتنی عمر ہونی چاہئے جس سے یہ نظر آنے کے قابل (Visible) ہو جائے۔ پس رات کے 12 بجے Birth of moon پر چاند کے حکم کا فیصلہ ہونے لگے تو اس سے اصل رویت سے یقیناً ایک دن کا فرق پڑ جائے گا کیونکہ ماہرین فن کے نزدیک چاند کو نظر آنے کیلئے تقریباً 17 گھنٹے کی عمر درکار ہوتی ہے جبکہ غروب آفتاب اور رات کے 12 بجے میں اوسطاً 6 گھنٹے کا فصل ہوتا ہے۔ اس طرح 17 اور 6 گھنٹے مل کر 23 بن جاتے ہیں جو کہ تقریباً ایک دن کے برابر ہے۔ امت کا اتحاد بہت ضروری ہے، لیکن جب خلاف حقیقت امر پر اتحاد ممکن ہی نہیں تو ایسے اتحاد کی کوشش مزید انتشار کا باعث ہوگا۔ جہاں تک مذکورہ موقف کا دوسرا دعویٰ ہے تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے:

صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته فان غم عليكم فاكملوا عدة شعبان ثلثين

''یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو اور اگر آپ کے سامنے آڑ (غم) ہو جائے تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کرو۔''

اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں علم فلکیات وموسمیات میں انسان کے پاس وہ علم، تجربہ، مشاہدہ اور آلات نہیں تھے جو آج دستیاب ہیں، لہٰذا یہ ادعاء بالکل باطل ہے

کہ حدیث شریف میں ''رویت'' علم کے معنیٰ میں ہے، جبکہ آج کل کے حالات میں چاند کے علم میں ''غُمّ'' ممکن نہیں۔ کیونکہ اب چاند کا ایک سیکنڈ کی غلطی کے بغیر ٹھیک ٹھیک (Accurate) حساب مرتب ہو چکا ہے، لیکن ہم جدید علوم، تجربے، مشاہدے اور آلات کی مدد سے منشائے کتاب وسنّت کو صحت کے اعلیٰ معیار پر حاصل کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں، لیکن اسے باطل کرنے کی جسارت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ قطعی طور پر طے ہے کہ رویت سے مراد ''رویت علمی'' نہیں بلکہ ''رویت بصری'' ہے، کیونکہ اصول فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کے معنیٰ حقیقی متروک یا متعذر نہ ہوں، تو حقیقت پر ہی عمل ہوگا اور الحمدللہ! حدیث مبارک...... صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته...... میں رویت کا حقیقی معنیٰ قرنِ اوّل سے آج تک معمول بہ بھی ہے، قابل عمل بھی ہے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی تعذر بھی نہیں، لہٰذا معنیٰ حقیقی سے عدول کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے ثبوت رویت کیلئے قضاء شرعی کا مدار رویت عینی پر ہی ہوگا۔

اگلے سوال کا جواب بھی اس میں آ گیا کہ صرف چاند کی پیدائش یا سورج غروب ہونے کے وقت چاند کا وجود فیصلہ کن نہیں بلکہ چاند کی رویت ضروری امر ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق کسی مشہور محقق نے رویت ہلال کا یہ مفہوم نہیں لیا جس کا اس سوال میں ذکر ہے، امت کے اتحاد پر پہلے بات ہو چکی ہے۔ امت مسلمہ کا اتحاد غیر منطقی بنیادوں پر ممکن ہی نہیں اس لیے اس کی کوشش فضول اور تضیع اوقات کا باعث ہے۔

ہم ایک اسلامی ملک کے شہری تو ہیں لیکن سعودی اتھارٹیز اور اداروں کے سامنے ہماری جانب سے بعض مسائل اٹھانے میں کچھ دشواریاں حائل ہیں، حکومتی سطح پر بعض مصلحتیں بھی رکاوٹ بن جاتی ہیں، سفارتی حساسیت (Diplomatic Sensitivity) اور تیل پیدا کرنے والے اسلامی ممالک کا اپنی وافر دولت پر زعم بھی

ایک وجہ بے اعتنائی ہے۔ لیکن آپ مغرب میں ہیں، مغرب سے اٹھنے والی آواز پر وہ کان ضرور دھرتے ہیں کیونکہ ان کی سلطنت واقتدار کی بقاء ان کی مرہون منت ہے۔ لٰہذا آپ علماء اور ماہرین فلکیات کا ایک وفد مرتب کر کے پہلے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے ثقہ علماء، میں اس مسئلے پر اجماع کلی یا اکثری (Consensus)، جیسا بھی حالات کے تحت ممکن ہو، پیدا کرنے کی کوشش کریں، پھر دیگر ممالک ایشیاء، افریقہ و عالم عرب سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اس میں شریک کریں۔ اس کے بعد ایک وقیع وفد ترتیب دے کر سعودی سفیر سے ملاقات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں اور ان کے توسط سے اس مسئلے پر اپنے افکار و خیالات سے سعودی وزارت خارجہ و وزارت اوقاف و مذہبی امور تک پہنچائیں اور آخری مرحلے میں سعودی علماء، ماہرین فلکیات وموسمیات اور سیاسی قیادت سے براہِ راست مذاکرات کریں۔ یہ تمام عمل بلاشبہ بڑا صبر آزما اور جہد مسلسل وسعی پیہم کا متقاضی ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ بالآخر یہ ثمر آور اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان اور زونل رویت ہلال کمیٹیوں میں تمام مکاتب فکر کے علماء شامل ہیں اور پورا ملک اس کے فیصلے کو تسلیم کرتا ہے، آپ بھی ایسی کمیٹی تشکیل دے سکتے ہیں۔

رویتِ ہلال کے مسئلہ پر
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
کی رائے ملاحظہ فرمائیں

چاند کے متعلق چند بنیادی معلومات

چاند سماوی کائنات میں زمین کا قریب ترین فلکی پڑوسی ہے جو سورج کی روشنی سے چمکتا اور اس کے باعث دکھائی دیتا ہے۔ اس کا قطر 2160 میل (3476km)

اور نصف قطر 1080 میل (1738km) ہے جو کہ سائز میں زمین کا ایک چوتھائی بنتا ہے۔ مگر نظام شمسی کے دیگر چاندوں کے مقابلے میں یہ اپنے سیارہ کا سب سے بڑا چاند ہے۔ زمین سے اس کا صحیح اوسط فاصلہ 2,38,900 میل (3,84,400km) ہے۔ جسے عام طور پر 2,38,000 میل سے 2,40,000 میل لکھ دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ زمین کے گرد بیضوی شکل میں گردش کرتا ہے اس لیے زمین سے اس کا فاصلہ ہر ماہ کی گردش کے دوران مختلف مقامات سے کم وبیش ہوتا ہے جو کم از کم 3,56,000 کلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ 4,07,000 کلومیٹر بنتا ہے۔ اس کا مدار زمین کے مدار کی طرف جس میں وہ سورج کے گرد گردش کرتی ہے، پانچ ڈگری جھکاؤ رکھتا ہے۔

چاند زمین کے گرد اپنا ایک مدار 27 دن، 7 گھنٹے 43 منٹ اور 11.6/11.5 سیکنڈ کی مدت میں مکمل کرتا ہے اور واپس اسی جگہ پر آجاتا ہے مگر یہاں ایک بڑی اہم بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ زمین بھی چونکہ اسی سمت میں اس دوران اپنے مدار میں سورج کے گرد حرکت پزیر ہوتی ہے اور چاند اس کے گرد حرکت پزیر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے لہٰذا دونوں (زمین اور چاند) اس مذکورہ عرصہ میں سورج کے گرد گردش کے کل راستے کا 1/13 حصے طے کر چکے ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ یہ سورج سے 27 ڈگری فاصلہ پر ہو جاتے ہیں۔ گویا سورج فلکی دائرہ میں ان سے 27 ڈگری جانب مشرق ہو جاتا ہے لہٰذا چاند زمین کے گرد اپنا مدار (27 دن، 7 گھنٹے، 43 منٹ اور 11.5 سیکنڈ میں) مکمل کر کے واپس زمین اور دیگر ستاروں کے حوالے سے فلک میں سابقہ پوزیشن پر آجاتا ہے مگر سورج اور زمین کے باہمی زاویہ کی نسبت سے اس جہت پر نہیں پہنچ سکتا جس میں وہ پہلے اسی جگہ پر تھا۔ کیونکہ زمین بھی اسی عرصہ میں اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے سورج سے 27 ڈگری زاویہ پر ہو چکی ہوتی ہے۔ یعنی چاند نے اپنا مدار ''مقام قران'' (قران شمس وقمر) سے

شروع کیا تھا جہاں پر وہ سورج اور زمین کے درمیان 0 ڈگری پر ایک ہی خط میں تھا اس کی اس وقت کی کیفیت کو نیا چاند کہتے ہیں۔اب وہ 27 دن، 7 گھنٹے، 43 منٹ اور 11.5 سیکنڈ کے بعد اپنا مدار مکمل کر کے فلک میں اس مقام پر تو پہنچ جاتا ہے جہاں پچھلا قران واقع ہوا تھا مگر اب اس مقام پر نیا ''قران شمس وقمر'' ممکن نہیں ہوتا کیونکہ زمین اور سورج کے درمیانی خط کا زاویہ بدل چکا ہوتا ہے۔ چاند کو دوبارہ اپنے آپ کو اس خط میں 0 ڈگری کے زاویہ پر لانے (گویا دوبارہ سورج، چاند اور زمین کے ایک ہی خط میں ہو جانے) کیلئے کچھ سفر مزید کرنا ہوتا ہے۔ اس سفر کی تکمیل پر کچھ وقت زائد لگتا ہے چنانچہ چاند کو دوبارہ ''حالت قران'' تک پہنچنے کیلئے مجموعی طور پر 29 دن، 12 گھنٹے، 44 منٹ اور 2.8 سیکنڈ لگتے ہیں۔ گویا واقعتاً پچھلے قران (نئے چاند کی ولادت) سے اگلے قران (نئے چاند کی ولادت تک) کا عرصہ ''29 دن، 12 گھنٹے، 44 منٹ اور 2.8 سیکنڈ'' ہے۔

مذکورہ بالا مدت میں ایک قمری مہینے کا خاتمہ اور نئے چاند کی ولادت ہو جاتی ہے۔ یہ عرصہ علم ہیئت وفلکیات کی جدید تحقیقات کے ذریعے حتمی وقطعی طور پر ثابت اور متعین ہو چکا ہے اس میں کسی ایک ماہ میں بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ علم زمانہ قدیم میں تحقیق وانکشاف کے اس درجہ تک نہیں پہنچا تھا بلکہ ظن وتخمین کی حالت میں تھا اس لئے پہلے دور کے علماء ومحققین اور علم ہیئت وفلکیات کے ماہرین اس مسئلہ پر اس قدر واضح اور متیقن نہ تھے۔ گویا قران (نئے چاند کی ولادت) کیلئے مطلوبہ مدت کا علم دور قدیم میں ظنی تھا جبکہ اب سائنسی تحقیقات اور فلکیات میں علم الحساب کے فروغ نے اسے علم یقینی کا درجہ دے دیا ہے۔

چند ضروری اصطلاحات

۱۔ قران (Conjunction)

جب چاند اپنی گردش مدار کے دوران سورج اور زمین کے درمیان ایک ہی خط میں 0 ڈگری کے زاویہ پر واقع ہوتا ہے تو عین اس وقت کو ''قران شمس وقمر'' یا اتصال شمس وقمر'' (Conjunction) سے تعبیر کرتے ہیں

۲۔ نیا چاند (New Moon)

علم فلکیات میں چاند کو اس حالت کو جب وہ قران (Conjunction) میں ہوتا ہے نئے چاند کی ولادت (Birth of New Moon) یا ''نیا چاند'' کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب چاند بالکل دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس وقت اس کا وہ حصہ جو جانب زمین ہوتا ہے سورج کی مخالف سمت میں ہونے کے باعث مکمل طور پر تاریک ہوتا ہے اور اس حصہ سے روشنی کی کوئی شعاع بھی زمین کی طرف نہیں آتی اس لیے وہ نظر نہیں آتا۔

۳۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا (Phases of the moon)

دور قدیم کے علماء وفقہاء علم فلکیات کی جدید تحقیقات کے فقدان کے باعث کہا کرتے تھے کہ چاند وقت قران میں سورج کی براہ راست شعاعوں کے غلبہ کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ اب صورتحال اس کے برعکس ثابت ہو چکی ہے، وہ یہ کہ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہے وہ فقط سورج کی روشنی سے چمکتا اور دکھائی دیتا ہے۔ بنابریں چودھویں رات کی کامل چمک بھی سورج کی چمک کے مقابلہ میں 1/4 لاکھ حصہ سے کم ہوتی ہے۔ چاند اور زمین دونوں کا فاصلہ سورج سے کم وبیش برابر ہے اس لیے دونوں پر فی مربع انچ کے حساب سے سورج کی شعاعیں تقریباً برابر ہی پڑتی ہیں۔ لہٰذا چاند کا

جو حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے وہ روشن ہو جاتا ہے اور جو حصہ اس کی پچھلی جانب ہوتا ہے تاریک ہو جاتا ہے۔ قران کے وقت چونکہ چاند بالکل سورج اور زمین کے درمیان ایک ہی خط میں صفر درجہ پر واقع ہوتا ہے اس لیے اس کا نصف حصہ جو سورج کی طرف ہوتا ہے کاملاً روشن اور نصف آخر جس کا رخ زمین کی طرف ہوتا ہے مکمل طور پر تاریک ہو جاتا ہے اس لیے چاند بالکل دکھائی نہیں دیتا اور یہی حالت ''نیا چاند'' کہلاتی ہے۔ جب چاند اس خط سے آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں سورج سے اس کے فاصلے کا زاویہ بدلتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے توں توں اس کا جانب زمین حصہ تدریجاً روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ چاند کا جانب زمین رخ ہمیشہ ایک جتنا ہی رہتا ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے کہ چاند زمین کے گرد اپنی گردش کے علاوہ خود اپنے محور کے گرد بھی گردش پذیر رہتا ہے اور یوں اس کی گردش دوہری ہوتی ہے مگر اس دوہری گردش کے باوجود چاند کا 59% حصہ زمین کی جانب رہتا ہے اور 41% دوسری سمت جو ہمیں کبھی بھی دکھائی نہیں دیتا جب ہم چودھویں رات میں ماہ کامل دیکھتے ہیں تو فی الحقیقت اس وقت ہم چاند کا 59% حصہ دیکھ رہے ہوتے ہیں بقیہ 41% اس شب بھی نظر نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اس کا رخ اس وقت زمین اور سورج دونوں کی مخالف سمت ہوتا ہے اور وہ تاریک ہوتا ہے۔ نئے چاند کی ولادت کے وقت چاند کی جانب زمین کی سمت ساری تاریک ہوتی ہے اس لیے وہ بالکل نظر نہیں آتا۔ پھر جوں جوں دن اور ساعتیں گزرتی جاتی ہیں تو گردش قمر کے عمل سے رفتہ رفتہ چاند کی جانب زمین کی سمت 59% میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ سورج کی شعاعوں کے باعث روشن ہونے لگتا ہے، جو حصہ روشن ہو جاتا ہے وہ ہمیں دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طرح قمری مہینہ کے پہلے ہفتہ میں چاند تقریباً ایک چوتھا (Quarter) حصہ روشن ہو جاتا ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے دوسرے ہفتہ کے اختتام پر 14 ویں شب میں نصف سے

زائد 59% حصہ پورا کا پورا روشن ہو جاتا ہے جسے ہم ماہِ تمام کہتے ہیں۔ اس مقام پر بھی چاند، سورج اور زمین کی دوسری سمت ایک ہی خط میں صفر درجہ پر ہوتا ہے۔

پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے ہفتہ میں چاند کا جانب زمین روشن حصہ کم ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ آخر میں دکھائی دینا بند ہو جاتا ہے۔ اسی عمل کو عرفِ عام میں چاند کا گھٹنا اور بڑھنا کہتے ہیں حالانکہ فی الواقع چاند نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ صرف جو حصہ جانب زمین روشن ہوتا ہے گردش کے باعث اس کے زاویئے اور سمتیں بدلتی رہتی ہیں اس لیے ہمیں اس کی شکلیں بھی بدلتی دکھائی دیتی ہیں اور اس کا وجود بھی گھٹتا بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت میں منظر اور مشاہدہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے نہ کہ چاند۔

۴۔ ہلال (Crescent)

جب چاند حالت قِران میں ہوتا ہے تو کلیتاً دکھائی نہیں دیتا۔ جب اپنے مدار میں گردش کے دوران ذرا آگے بڑھتا ہے تو کچھ وقت کے بعد اس کے جانب زمین تاریک حصہ میں سے کچھ حصہ پر سورج کی روشنی پڑنے لگتی ہے اور وہ روشن ہو کر دکھائی دینے لگتا ہے۔ جب ہر ماہ ولادت قمر (Birth of New Moon) کے بعد پہلی مرتبہ چاند غروب آفتاب کے بعد مطلع پر نظر آتا ہے تو اس کی شکل ایسی "C" ہوتی ہے۔ اسے "ہلال" کہتے ہیں۔

۵۔ رویت ہلال (Cresent Visibility)

نئے چاند کو ہلال بننے اور قابل رویت ہونے تک کچھ وقت لگتا ہے جو کم از کم ایک دن ہے۔ ہم اس امر سے آگے چل کر بحث کریں گے۔ رویت ہلال کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ ننگی آنکھ سے رویت Naked eye sighting visibility

۲۔ آلاتی دوربینی رویت Telescopic sighting visibility

ہلال کو ننگی آنکھ سے دیکھنا یا جدید رصد گاہی آلات اور دوربین کے ذریعے دیکھنا، دونوں رؤیتیں اصلاً ایک ہی چیز ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر کوئی تضاد یا مخالفت نہیں ہے۔ بلکہ دوسری صورت، پہلی ہی صورت کیلئے ممد ومعاون کا درجہ رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ننگی آنکھ سے رؤیت ہلال میں درج ذیل مقامی کیفیات اثر انداز ہوتی ہیں۔

۱۔ مطلع کی کیفیت کیا ہے؟ صاف ہے یا ابر آلود ہے؟
۲۔ فضا کس قدر شفاف یا گرد آلود ہے؟
۳۔ مقام مشاہدہ کا محل وقوع کیا ہے؟
۴۔ مقام مشاہدہ کی سطح سمندر سے بلندی کس قدر ہے؟
۵۔ موسم کیسا ہے گرم یا سرد؟
۶۔ فضا میں نمی ہے یا خشکی؟
۷۔ دیکھنے والے کی عمر اور بصارت وغیرہ۔ الغرض یہ تین قسم کے عوامل ہیں جو ظاہری و بصری رؤیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

۱۔ موسمیاتی عوامل (Atmospheric Factors)
۲۔ بصری عوامل (Optical Factors)
۳۔ انسانی عوامل (Human Factors)

ان کی وجہ سے بسا اوقات کسی جگہ پر ہلال ہو چکا ہوتا ہے یعنی وہ ''نئے چاند'' یا قران کی حالت سے نکل کر حالت ہلال میں داخل ہو چکا ہوتا ہے مگر مطلع، فضا، مقام، موسم اور بعض دیگر عوامل کے باعث ننگی آنکھ سے کسی کو دکھائی نہیں دیتا حالانکہ وہ اصلاً قابل رؤیت ہو چکا ہوتا ہے۔ اسی صورت میں آلاتی و دوربینی رؤیت، انسانی کو مدد دیتی ہے۔ جو لوگ محض بصری رؤیت کو معتبر اور آلاتی و دوربینی رؤیت کو غیر معتبر سمجھتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رصد گاہی آلات اور دوربین کتنی ہی طاقتور کیوں

نہ ہو۔ ہلال کو عدم سے وجود میں نہیں لاسکتیں۔ اگر چاند حالت قران میں ہو اور ابھی مقام ہلال یعنی قابل رویئت ہونے کی حالت تک نہ پہنچا ہو تو دنیا کا کوئی سائنسی آلہ بھی اسے دیکھ یا دکھا نہیں سکتا گویا دوربین کے ذریعے بھی رویئت اس وقت ممکن ہوتی ہے جب چاند ہلال بن کر قابل رویئت ہو چکا ہوتا ہے۔

ننگی آنکھ کی رویئت اور آلاتی و دوربینی رویئت اور ان کے درمیان فرق

مذکورہ بالا دونوں رویئتوں میں فقط یہ فرق ہے کہ مطلع کی مقامی فضائی اور موسمی کیفیات کے باعث چاند کو ولادت کے بعد بالعموم 24 گھنٹے یا اس سے زائد مدت گزرنے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ بعض اوقات استثنائی کیفیات میں اس سے کم مدت میں بھی رویئت ہلال ہو جاتی ہے۔

مثلاً پاکستان (لاہور) میں درج ذیل تاریخوں میں 24 گھنٹے سے کم مدت میں نئے ہلال (Lunar Cresent) کی رویئت ہوئی ہے۔

ننگی آنکھ کی رویئت کا ریکارڈ

۱۔ 20 جنوری 1977ء کو صفر کا چاند (ہلال) 22 گھنٹے کی عمر میں نظر آیا۔ (اس کی ولادت 19 جنوری کو شام 7:11 بجے ہوئی اور اس کی رویئت 20 جنوری کو شام 5:28 بجے ہوئی)۔

۲۔ 11 دسمبر 1977ء کو محرم کا چاند 19 گھنٹے کی عمر میں نظر آیا۔

۳۔ 8 فروری 1978ء کو ربیع الاول کا چاند 22 گھنٹے کی عمر میں نظر آیا۔

۴۔ 27 فروری 1979ء کو ربیع الثانی کا چاند 20 گھنٹے کی عمر میں نظر آیا۔

۵۔ 21 جولائی 1982ء کو شوال کا چاند 19 گھنٹے کی عمر میں نظر آیا۔

اس طرح کے ریکارڈ کے شواہد بالعموم برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں بھی ملتے ہیں مگر کچھ ننگی آنکھ کی رویئتیں نہایت غیر معمولی طور پر موافق کیفیات

میں اس سے بھی کم عمر ہلال کی واقع ہوئی ہیں۔

۶۔ بتاریخ 10 فروری 1910ء انگلینڈ میں 16 گھنٹے کی عمر کا چاند دیکھے جانے کا ثبوت ملا ہے۔
(Observatory, 34, 162, 203, 305, 344,374-1911)

۷۔ اسی طرح بتاریخ 22 جولائی 1895ء انگلینڈ میں 14 گھنٹے 45 منٹ کی عمر کا چاند دیکھا گیا تھا۔(Observatory, 34, 374-1911)

۸۔ اسی طرح بتاریخ 2 مئی 1916ء انگلینڈ میں 14 گھنٹے 30 منٹ کی عمر کا چاند دیکھا گیا تھا۔ (Journal of the British Astronomical Association, 27, 36-1916)

الغرض ہمیں اب تک کے میسر ریکارڈ میں سے کم سے کم ساڑھے چودہ گھنٹے کی عمر کا ہلال دیکھے جانے کا ہی ثبوت مل سکا ہے ورنہ ساڑھے چودہ گھنٹے سے زائد اور چوبیس گھنٹے سے کم عمر کا ہلال دیکھے جانے کے تو بہت سے شواہد بین الاقوامی ریکارڈ پر موجود ہیں۔ بہر حال مذکورہ بالا شواہد سے اس قدر معلوم ہو گیا ہے کہ ننگی آنکھ سے رویت ہلال کا امکان چوبیس گھنٹوں سے کم ساڑھے چودہ گھنٹوں تک کس طرح آ گیا ہے۔ بیشک یہ استثنائی کیفیات میں بڑے نادر واقعات ہیں مگر پھر بھی امکان رویت بصری کیلئے کافی ہیں۔ اب ہم ننگی آنکھ کی رویت کے ریکارڈ کا دور بینی رویت کے ریکارڈ سے موازنہ کرتے ہیں۔

دور بینی رویت ہلال کا ریکارڈ

اب تک میسر ریکارڈ کے مطابق دور بین (Binoculars Telescope) سے کم از کم 13.5 گھنٹوں کے ہلال کی رویت کا ثبوت مل سکا ہے۔

دیکھنے والے کا نام: Rebert C Victor

استعمال ہونے والے دوربین: Tripod-Mounted11x80 Binoculars

مقام مشاہدہ: Michigan

تاریخ: 5 مئی 1989ء

(Sky and Telescope, Sep 1989, Page. 322)

عصر حاضر کے نامور فلکیات Doggett اور Schaefer کی رائے میں یہ دوربینی رویئت کا ریکارڈ ہے جس کا بدلنا خاصا مشکل ہوگا۔ (Sky and Telescope. July 1994 Page.14)۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ننگی آنکھ کی رویئت اور آلاتی رویئت کے ریکارڈ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔

ننگی آنکھ کی رویئت کا ریکارڈ	دوربینی رویئت کا ریکارڈ
14.30 گھنٹے کے ہلال کی رویئت	13.05 گھنٹے کے ہلال کی رویئت
1916ء	1982ء

ایک اہم نکتہ

یہ موازنہ اور تحقیق اس لئے پیش کی گئی ہے کہ وہ مذہبی ذہن جنہیں سائنسی تحقیقات وانکشافات سے عدم واقفیت کی بناء پر بلاوجہ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی سے اختلاف اور نفرت ہے اور وہ سائنسی آلات اور ان کے مشاہدات کی نسبت مغالطہ اور بدگمانی میں مبتلا رہتے ہیں وہ اپنا خیال درست کرسکیں کہ دوربین نے کسی ناممکن کو ممکن یا معدوم کو موجود نہیں بنایا بلکہ ایک ممکن کو ہی سہل اور آسان کرکے دکھایا ہے۔ ننگی آنکھ کی رویئت میں چاند (ہلال) کا 20 گھنٹوں سے بھی کم عمر میں حتیٰ کہ ساڑھے چودہ سے سولہ گھنٹوں کی عمر میں دکھائی دیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ پیدائش قمر (قران) کے بعد ہلال بعض اوقات اتنے عرصہ میں بھی ننگی آنکھ سے دیکھے جانے کے قابل ہو جاتا

ہے مگر مختلف مطالع پر مقامی، موسمی اور فضائی یا ز ادیائی کیفیات کے باعث عام طور پر دکھائی نہیں دیتا۔ دوربینی یا رصدگاہی آلات نے انہیں رکاوٹوں کو دور کر کے عمل رویت کو شفاف کر دیا ہے اور چاند جو بصورت ہلال مطلع پر پہلے سے ہی موجود تھا اسی کو واضح کر دکھایا۔ حقیقتاً دوربین سے بھی ہلال کو انسانی آنکھ نے ہی دیکھا ہے۔ یہ بھی کاملاً بصری رویت ہے مگر بغیر آلات کی مدد کے ہے درحقیقت ہم جسے ظاہری و بصری رویت کہتے ہیں وہ بغیر امداد آلات کے بصری ہے اور جسے دوربینی آلاتی یا رصدگاہی رویت کہا جاتا ہے وہ بھی بصری رویت ہی ہے مگر امداد آلات کے ساتھ۔ اس کی مثال نظر کی عینک ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک شخص کی بینائی کمزور ہو جائے تو عینک کی مدد سے وہ اپنی طبعی قوت مشاہدہ میں اضافہ کر لیتا ہے۔ اسے ہر کوئی جائز سمجھتا ہے تو دوربین جیسے آلات بھی اس قبیل میں آتے ہیں کیونکہ ان سے بھی فقط قوتِ مشاہدہ اور استعداد ادراک میں اضافہ ہوتا ہے اور چاند جو بعض اوقات یا بعض مقامات پر مطالع کی دھندلاہٹ کے باعث ننگی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا۔ یہ آلات ان کی رویت آسان اور شفاف بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا شرعاً وعقلاً آلات کی مدد سے واقع ہونے والی رویت اور ننگی آنکھ کی رویت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ایک اور توجہ طلب پہلو

یہاں یہ امر بہت اہمیت کا حامل ہے کہ کئی مقامات پر چاند پہلے ننگی آنکھ سے نہ دیکھا جاسکا، اسے دوربین کی مدد سے دیکھا گیا مگر اس کے بغیر جب کہ اس کا محل وقوع صحیح طور پر معلوم ہو گیا تو دوبارہ ہلال ننگی آنکھ سے بھی دیکھ لیا گیا۔ مثلاً

ا۔ 14 اپریل 1953ء کو بیلجیئم (Belgium) میں Leopoldsburg کے مقام پر دوربین کے ذریعے شام 6:54 بجے نیا ہلال دیکھا گیا جو کہ ننگی آنکھ سے دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پھر دیکھنے والے نے دوربین کی مدد سے محل وقوع

ٹھیک طرح جان لینے کے بعد دوبارہ ننگی آنکھ سے دیکھنا شروع کیا تو اس نے 7:10 پر (ٹھیک سولہ منٹ کے بعد) اسی جگہ ہلال کو ننگی آنکھ سے بھی دیکھ لیا۔

۲۔ نیویارک میں 8 دسمبر 1942ء کو چاند پہلے دوربین کے ذریعے دیکھا جاسکا بعد ازاں دوربین کی مدد سے محل وقوع کی صحیح دریافت کے بعد اسی جگہ ننگی آنکھ سے بھی دیکھ لیا گیا۔اس وقت ہلال کی عمر 19:45 گھنٹے تھی۔

۳۔ اسی طرح 14 جولائی 1988ء اور 6 اپریل 1989ء کو Schaefer اور Doggett ہلال کی مختلف حالتوں اور زاویوں سے ننگی آنکھ کی رویت اور بصری آلات کی مدد سے رویت کے نتائج کا موازنہ کیا ہے جن میں پانچ مختلف نمونے درج ذیل ہیں۔

	بغیر آلات بصری رویت	آلات کی مدد سے بصری رویت
ا۔	11% رویت	71% رویت
۲۔	20% رویت	66% رویت
۳۔	34% رویت	67% رویت
۴۔	38% رویت	75% رویت
۵۔	59% رویت	82% رویت

اس موازنہ سے معلوم ہوا کہ ننگی آنکھ سے رویت اور بصری آلات کی مدد سے رویت میں ہلال کا مشاہدہ کرنے والوں کے عددی تناسب میں کس قدر فرق واقع ہو جاتا ہے۔ایک اور بات جو رویت ہلال کے سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، وہ غروب آفتاب کے بعد وقت کا معاملہ ہے۔عوام الناس کا یہی خیال اور معمول ہے کہ رویت کی شام ہلال کو غروب آفتاب کے فوراً بعد دیکھا جاتا ہے، مطلع بالکل صاف ہونے کی صورت میں جب وہ ایک خاص وقت تک دکھائی نہیں دیتا تو یہی خیال کر لیا

جاتا ہے کہ چاند نہیں ہوا جبکہ رصد گاہی آلات دراصل یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہلال غروب آفتاب کے کتنی دیر بعد قابل رویت ہوگا اور کتنی دیر تک مطلع پر رہے گا اور یہ کہ زمین سے کس زاویے پر اور افق سے کس بلندی پر دیکھا جاسکے گا۔

ان معمولات سے امکان رویت کافی حد تک بڑھ جاتا ہے۔ الغرض یہ بات بالیقین جان لینی چاہئے کہ دوربینی رویت یا دیگر آلات کے ذریعہ رصد گاہی رویت بصری رویت کی قائمقام نہیں بلکہ یہ خود بصری رویت ہی ہے۔ اس پر عدم اعتماد کا کوئی شرعی و عقلی جواز نہیں ہے۔

ننگی آنکھ کی رویت اور دوربینی رویت میں استعدادی فرق

ننگی آنکھ (Naked Eye) اور دوربینیں سب بصری آلات ہی ہیں۔ امتیاز صرف یہ ہے کہ ان کی استعداد اور قوت مشاہدہ میں فرق ہوتا ہے۔ ان سب میں چھوٹی یا بڑی طاقت کے عدسات ہوتے ہیں اور ان کا بنیادی کام یکساں ہوتا ہے۔

۱۔ ننگی آنکھ سے ہم آسمان میں چھ ڈگری وسعت تک کسی ستارے کو دیکھ سکتے ہیں۔

۲۔ ایک انچ کی دوربین سے ہم انہیں 9 ڈگری تک دیکھ سکتے ہیں۔

۳۔ دو انچ کی دوربین سے وسعت مشاہدہ 10.5 ڈگری تک بڑھ جاتی ہے۔

۴۔ تین انچ کی دوربین سے وسعت مشاہدہ کا اضافہ 11.5 ڈگری تک ہو جاتا ہے۔

۵۔ اسی طرح 200 انچ کی دوربین جو کیلیفورنیا میں Mount Palomar Observatory میں نصب ہے اس سے بصری حدود 19 سے 20 ڈگری وسعت تک بڑھ جاتی ہیں اور اگر اس کے ساتھ خصوصی الیکٹرونک آلات استعمال کیے جائیں تو ان کی مدد سے 25 ڈگری وسعت تک کے اجرام

فلکیات کی تصاویر بھی لی جاسکتی ہیں۔

۶۔ اسی طرح عام ننگی آنکھ کی استعداد ادراک اور قوت مشاہدہ کے مقابلے میں 8x30 کی عام دوربین کی قوت آٹھ گنا بڑھ جاتی ہے۔

۷۔ اگر اس کے سامنے مزید ایک عدسہ جو 30 ملی میٹر کا ہو لگا دیا جائے تو اس سے عام آنکھ کی رویت کے مقابلے میں چالیس گنا زیادہ نتائج میسر آتے ہیں۔

الغرض بنیادی بات یہی ہے کہ دوربینی اور آلاتی رویت بھی ننگی آنکھ کی طرح بصری رویت ہی ہے مگر فرق یہ ہے کہ دوربین وغیرہ سے بصری رویت کی حدود مشاہدہ اور استعداد ادراک خاصی بڑھ جاتی ہے اس وجہ سے فلکی اجرام کی رویت میں آسانی ہو جاتی ہے۔

رصدگاہی رویت ہلال کی تاریخ اور فلکیاتی علم الحساب

آپ نے اوپر کی سطور میں پڑھ لیا ہے کہ علم الفلکیات میں ابزرویٹری (Observatory)، پلانیٹیریم (Planitarium)، طلوع وغروب آفتاب کا فلکیاتی جدول اور المانک (Almanac) وغیرہ کی ایجادات میں مسلم سائنسدانوں کا کتنا اہم کردار ہے۔

واقعتاً مسلمان ہی اس علم جدید کے بانی اور موسس ہیں۔ مغربی تحقیقات کی تاریخ بھی اس بات پر متفق ہے کہ رویت ہلال کے بارے میں بیشتر فلکیاتی فارمولوں کے بانی بھی مسلمان ہیں۔ آج افسوس کی بات ہے کہ زوال کے باعث امت مسلمہ اپنے تاریخی، علمی اور سائنسی ورثے سے اس قدر لاتعلق اور بے خبر ہو گئی ہے کہ خود انہیں ہی اس کے شرعی جواز پر قائل کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔

علم الہیت سے علم الحساب تک

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ علم الہیت کو ترقی دیکر اسے علم الحساب

کے درجہ تک پہنچانے کی ترغیب مسلمانوں کو قرآن مجید نے دی تھی۔ سورج اور چاند وغیرہ کی فلکیات گردش کے نظام کو کاملاً حساب کی صورت میں جاننا اور اسے قطعی اور یقینی علم کے مقام تک پہنچانا ان آیات قرآنی کے حکم کی تعمیل میں مسلم ماہرین فلکیات نے اپنا مطمع نظر بنایا اور انہوں نے اس علم کو اس قدر فروغ دیا کہ ایک ہزار سال کے قریب عرصہ تک وہ اس میدان میں بھی پوری دنیا کے امام مقتداء رہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۞ (الرحمٰن)

"اور سورج اور چاند معلوم اور مقررہ (فلکیاتی) حسابات سے (گردش میں) ہیں۔"

یعنی سورج کا طلوع وغروب اس کی گردش مدار اور اس کی منازل وزاویہ جات سب مقررہ اور معلوم حساب کے تحت ہیں۔ اسی طرح چاند کی پیدائش پھر اس کا ہلال بننا، ربع اول پھر اس کا بدر بننا ربع آخر اور محاق کے مرحلے سے گزرتے ہوئے قران پر آ کر نیا چاند بننا یہ بھی سب کچھ مقررہ فلکیاتی حساب کے مطابق ہے۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے،

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ (یونس ۱۰:۵)

"وہی ہے جس نے سورج کو روشنی (کا منبع) بنایا اور چاند کو (اس سے) روشن (کیا) اور اس کیلئے (کم وبیش دکھائی دینے کی) منزلیں مقرر کیں تا کہ تم برسوں کا شمار اور (اوقات کا) حساب معلوم کر سکو۔"

ان آیات کی ضروری توضیح اور شرعی وفلکیاتی افادیت آگے بیان ہوگئی مگر اس جگہ فقط یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ نظام شمس وقمر کے جملہ معاملات اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ باقاعدہ حسابات کے تحت ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حسابات کو صحیح طریقے

سے جان لینا ان کو معلوم کرنے کیلئے ضابطے اور فارمولے وضع کرنا تا کہ فلکیاتی حسابات کے مطابق سورج اور چاند کی گردشوں مرحلوں اور زاویوں کا ٹھیک تعین ہو سکے اور اس علم پر یقین کرنا نا صرف انسان کیلئے ممکن اور جائز ہے بلکہ عین فرمان الٰہی اور منشائے حکم قرآنی ہے۔ اسی منشاء ربانی کو پورا کرنے کیلئے مسلم سائنسدانوں اور ماہرین نے علم ہیت کو ترقی دے کر اسے علم الحساب کے درجے تک پہنچا دیا اور فلکیاتی علم الحساب کے ذریعہ سورج اور چاند کی گردشوں کے مستقل جدول بنائے:

چنانچہ فلکیاتی علم الحساب کی تاریخ تین ادوار پر مشتمل ہے۔

۱۔ قدیم:

عراقی (بابلی) دور پر مشتمل یہ زمانہ ماقبل مسیح کی تاریخ ہے۔

۲۔ وسطی:

یہ دور جدید فلکیات، علم رویت ہلال اور فلکیاتی علم الحساب کی بنیاد ہے۔ یہ سب دور اسلامی ہے۔

۳۔ جدید:

یہ دور مغربی ہے اس نے سارا ورثہ عالم اسلام سے پایا اور اسی کو آگے بڑھایا ہے۔ گویا 8 صدی عیسوی سے 16 ویں صدی عیسوی تک آٹھ نو سال بعد جدید علم رویت ہلال اور فلکیاتی تحقیق کا نظام صرف مسلمانوں ہی کی زیر نگرانی فروغ پذیر رہا ہے۔ اس دور کے چند قابل ذکر اور نمایاں اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ امام یعقوب بن طارق (8 ویں صدی عیسوی)

۲۔ امام محمد بن موسیٰ خوارزمی (9 ویں صدی عیسوی)

۳۔ امام ابو جعفر الخازن (10 ویں صدی عیسوی)

۴۔ امام محمد بن ایوب طبری (11 ویں صدی عیسوی)

۵۔ الشیخ الفہاد (12ویں صدی عیسوی)

۶۔ الشیخ موسیٰ بن میمون (12ویں صدی عیسوی)

رویئت ہلال کی رصدگاہی پیشین گوئی کے بنیادی ضابطے

وہ اصول جن سے سورج، چاند اور زمین اپنے اپنے مدار میں حرکت پزیر ہیں ان کے طلوع وغروب کے حسابات ان کی گردشیں رفتاریں اور اوقات ان کے باہم زاویئے اور فاصلے پر چاند کا زمین اور اپنے فلک کی نسبت سے گھنٹوں منٹوں اور سیکنڈوں تک کی تفصیلات حتمی وقطعی طور پر معلوم ہو چکی ہیں بلکہ ایک سیکنڈ کے قلیل ترین حصہ کا وقت بھی پوری صحت وقطعیت کے ساتھ شمار میں آچکا ہے اور عرصہ ہائے دراز کے مطالعہ و مشاہدہ کے بعد یہ تمام اعداد وشمار باقاعدہ حساب و کتاب اور فارمولوں کی شکل میں قطعی ویقینی علم کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں اس لیے علم الھیئۃ اور علم الرؤیہ اب فی الحقیقت ''علم الحساب'' بن گیا ہے۔

اس میں اب ظن وخطا کی وہ کیفیت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اس وقت ہمارے فقہائے کرام علم الفلکیات کے ماہرین کے اندازوں کو کاملاً درست تسلیم نہیں کرتے تھے اس لئے ان پر مدار رویئت ممکن نہ تھا اس وقت تک اس باب میں سائنسی تحقیقات ومعلومات خود بلوغ وکامل اور فلکیاتی حساب میں حتمیت اور قطعیت کے مقام تک نہ پہنچی تھیں مگر اب صورت حال یکسر بدل چکی ہے۔ اب علم ہیت وفلکیات حساب کے درجہ میں ''علم یقین'' میں بدل چکا ہے۔ علم فلکیات میں رویت ہلال کی پیشین گوئی کیلئے تاریخی لحاظ سے اب تک تین مختلف ضابطے معرض وجود میں آئے ہیں۔

ا۔ قدیم ضابطہ (دور بابل کا پیمانہ)

اس ضابطہ کے مطابق رویئت ہلال کی پیشین گوئی کیلئے دو پیمانے استعمال

ہوتے تھے۔

ا۔ چاند کی عمر۔۔۔قران (ولادت قمر) سے وقت رویئت تک ہلال کی عمر کیا ہو گی؟

۲۔ غروب آفتاب سے غروب ماہتاب تک کتنا وقت درمیان میں ہو گا؟ گویا چاند غروب آفتاب کے کتنی دیر بعد غروب ہو گا؟ اسے Criteria Anciant کہتے ہیں

۲۔ وسطی ضابطہ (دور اسلام کا پیمانہ)

اس دور کا رویئت ہلال کی پیشین گوئی کا پیمانہ جو 8 ویں صدی عیسوی سے تا حال رائج اور متداول رہا ہے یہ ہے کہ وقت رویئت چاند کے سورج سے فاصلے کا زاویہ معلوم کیا جائے اسے Medieval Islamic Criteria کہا جاتا ہے۔

۳۔ جدید ضابطہ (دور مغرب کا پیمانہ)

موجودہ دور کی رویئت ہلال کی درست پیشین گوئی کیلئے جو پیمانہ مقرر کیا ہے اس میں دو چیزیں معلوم کی جاتی ہیں۔

ا۔ چاند کی غروب آفتاب کے وقت افق سے بلندی (Altitude) کتنی ہو گی؟

۲۔ چاند کا غروب آفتاب کے وقت افقی زاویہ (Azimuth) کیا ہو گا؟ اسے Modern Criteria کہتے ہیں۔

اس پیمانے پر تجربی اور علمی دونوں طریقوں سے کام ہو رہا ہے تاہم فلکیاتی رصدگاہ اور فلکیاتی المانک سے مذکورہ بالا جملہ پیمانوں کے مطابق مطلوبہ تمام معلومات باسانی حتمی اور قطعی طور پر حاصل ہو جاتی ہیں اور انہی کے ذریعے قران یعنی نئے چاند کی ولادت اور اس کے بعد رویئت ہلال کے امکان یا عدم امکان کا علم حاصل ہوتا ہے۔ (بحوالہ منہاج القرآن)

حصہ سوم

جدید معاشری مسائل اور ان کا شرعی حل

۱۔ پردہ کی شرعی حیثیت
۲۔ متعہ کا قانونی وشرعی تجزیہ
۳۔ مسلمان عورت کا مقام اور دائرہ کار
۴۔ انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت
۵۔ دینی مدارس کے نظام ونصابِ تعلیم کا تجزیہ

سپین میں حجاب پر پابندی

پردہ......قانونی، تمدنی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ

یہ 1989ء کی بات ہے کہ جب پہلی بار فرانس کے سکول میں پڑھنے والی مسلمان لڑکیوں کو صرف اس لیے سکول سے نکال دیا گیا کہ وہ سر پر سکارف پہن کر آتی تھیں۔ تب سے یہ سکارف فرانسیسی سیاسی اداروں کی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ستمبر 2003ء میں فرانس کے صنعتی شہر لل میں مسلمانوں نے ہائی سکول قائم کیا۔ یہ معروف معنوں میں مدرسہ تھا نہ کوئی مذہبی سکول بلکہ مثالی فرانسیسی تعلیمی ادارہ تھا جسے ابن رشد فلاسفر جو یورپ میں ''ایور'' کے نام سے پہچانے جاتے ہیں کے نام پر قائم کیا گیا۔ اس سکول کے قیام کے بعد مسلمان لڑکیاں مطمئن ہو گئیں کہ اب انہیں سکارف پہننے پر پابندی جیسے جانگسل مراحل سے نہیں گزرنا پڑے گا مگر سیکولر فرانس مسلمانوں کی اس دینی شناخت کے خلاف اپنے خبث باطنی کو چھپا نہ سکا اور مسلمان بچیوں کے سکارف پہننے پر باقاعدہ اسمبلی میں بل لا کر بحث کا آغاز کر دیا۔ واضح رہے کہ فرانس 6 کروڑ کی آبادی کا ملک ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد 50 لاکھ کے قریب ہے جو فرانس کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں۔ ان میں زیادہ تر شمالی افریقہ اور الجیریا کے مسلمان ہیں جو اپنی دینی اور ثقافتی پہچان برقرار رکھنا چاہتے ہیں لیکن فرانسیسیوں کی اپنی ثقافت کے غلبے کی ہوس نے انہیں اقلیتوں کی مذہبی علامات کے خلاف ایکشن لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ فرانس میں کیتھولک عیسائیوں کی اکثریت ہے اور کچھ یہودی بھی ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں۔ سکارف پر پابندی کی بحث کے دوران

ایک مسلمان لڑکی نے کہا کیا ہر کسی کو حق ہے کہ میرے بال دیکھے؟ اگر سکارف پر کسی غیر مسلم کو غصہ آتا ہے تو ریاست کا مسئلہ ہے کہ وہ اسے قابو کرے۔ ایک پاکباز خاتون کو اس کا لمبا لباس اور سکارف گلیوں میں پھرنے والے بدمعاشوں سے احساس تحفظ دلاتا ہے۔ مسلمان فرانس میں فیشن اور لباس پر اعتراض نہیں کرتے تو فرانسیسیوں کو سکارف پر اعتراض کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ دراصل اہل فرانس کی نفرت کی بنیادی وجہ ان کا ماضی کا نوآبادیاتی نظام ہے جس پر وہ ابھی تک قابو نہیں پا سکے۔ جب وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود الجیریا اور تنزانیہ کے باشندوں کو اپنے رنگ میں نہیں ڈھال سکے اس طرح فرانسیسی اس تہذیبی جنگ میں ناکام ہو گئے اور اب انہوں نے اس شکست کا حل یہ سوچا ہے کہ پارلیمنٹ کے ذریعے سکارف پر پابندی عائد کر دی جائے۔ تہذیبی شکست خوردگی کا یہ احساس صرف فرانس میں ہی نہیں پورے یورپ میں جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔ جرمنی کی عدالت میں سکارف کے حوالے سے کئی کیسز زیر بحث ہیں کہ آیا سکارف کو آزاد معاشرے میں پہننے کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ نہیں۔ اس سلسلہ میں جرمنی میں بھی کچھ عرصہ قبل دو طالبات کو صرف اس لیے سکول سے نکال دیا گیا کہ منع کرنے کے باوجود سکارف پہن کر سکول میں آئی تھیں۔

یورپ تو ایک طرف رہا ترکی جیسا نام نہاد مسلمان ملک جو اپنے آپ کو یورپی ملک خیال کرتا ہے میں بھی سکارف پہننے پر ایک خاتون ممبر پارلیمنٹ کو ملک سے باہر نکال دیا گیا اور اس کی شہریت ختم کر دی گئی۔

قبل اس کے کہ میں پردہ کے قانونی، تمدنی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ پیش کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کروں یہ ضروری ہے کہ اپنے قارئین کو پردہ کے معانی و مطالب سے آگاہی بخشوں۔

حجاب، نقاب اور پردہ کے معانی

خواتین کے پردہ کے حوالے سے مختلف الفاظ اور اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں جن میں پردہ، نقاب اور حجاب وغیرہ شامل ہیں۔ پہلے ان کے لغوی معنیٰ سمجھ لیں اس کے بعد ان کی شرعی حیثیت ملاحظہ فرمائیں۔

1- حجاب کا لغوی معنیٰ آڑ ہے یعنی دو چیزوں کے درمیان آڑ کو حجاب کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے ایک خاتون اپنے سر کے بالوں اور چہرے کو غیر مردوں سے چھپاتی ہے اس معنیٰ کی تائید قرآن مجید کی سورہ ص کی آیت نمبر 32 سے ہوتی ہے۔

حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ [1]

"یہاں تک کہ چھپ گئے پردے کے پیچھے"۔

اور اس کے علاوہ سورہ احزاب کی یہ آیت کریمہ بھی اس معنیٰ کی تائید کرتی ہے۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ [2]

"جب تم کو ازواج ہی سے کوئی چیز مانگنی ہو تو (دروازے پر لگے ہوئے) پردے کے پیچھے سے مانگا کرو"۔

2- اسی طرح خواتین چہرے کے پردے کیلئے نقاب استعمال کرتی ہیں۔ نقاب عربی زبان کا لفظ ہے جس کی جمع انقبہ ہے اور اصطلاح میں اس سے مراد وہ کپڑا ہے جس سے خواتین اپنے چہرے کو چھپاتی ہیں۔ نقاب والی خاتون کو منقبہ کہتے ہیں

3- پردہ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے اس کا معنیٰ بھی کس چیز کو چھپانا یا ڈھانپنا ہے۔

پردہ کی ابتداء

اگرچہ اسلام سے قبل کے الہامی مذاہب میں بھی خواتین کی ستر پوشی اور پردہ کے حوالے سے واضح تعلیمات انسانیت کو نصیب رہی ہیں بلکہ بہت سی تہذیبوں میں خواتین کے پردے کی روایت بڑی سختی سے چلتی رہی ہے تاہم تہذیبی و تمدنی حالات کے تناظر میں حدود پردہ میں فرق رہا ہے لیکن جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو سابقہ الہامی ہدایات اور فطری تعلیمات کا چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ اسلام نے تدریجاً انسانی زندگی کو تہذیب کی پٹڑی پر چڑھانے کا عمل شروع کیا۔ چنانچہ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دن بارگاہِ نبوی میں عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلم خواتین اور ازواج مطہرات کو حکم دیں کہ پردہ کر کے گھروں سے نکلا کریں تاکہ وہ منافقین کی ہوسناک نگاہوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آیاتِ پردہ نازل فرمائیں۔

آیات پردہ

سورۂ نور کی آیت نمبر 31 میں ارشاد فرمایا

"آپ حکم دیجئے ایمان دار عورتوں کو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی عصمتوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش ظاہر نہ کیا کریں مگر جتنا خود بخود نمایاں ہو اس سے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالیں رہیں اور اپنی آرائش ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کیلئے اور باپوں کیلئے یا اپنے شوہروں کے باپوں کیلئے یا اپنے بیٹوں کیلئے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کیلئے یا اپنے بھائیوں کیلئے یا اپنے بھتیجوں کیلئے یا اپنے بھانجوں کیلئے یا اپنی ہم مذہب عورتوں پر یا اپنی باندیوں پر یا ایسے نوکروں پر جو (عورت) کے خواہشمند نہ ہوں یا ان بچوں پر جو ابھی تک عورتوں کی شرم والی چیزوں پر آگاہ نہیں اور اپنے پاؤں زور سے (زمین پر) نہ ماریں تاکہ معلوم ہو جائے

وہ بناؤ سنگھار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں اور رجوع کرو اللہ کی طرف سب ایمان والو تا کہ تم (دونوں جہانوں میں) بامراد ہو جاؤ'' ؎

تفسیر ضیاء القرآن میں حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔

''پہلے مردوں کو نگاہیں نیچی رکھنے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا۔ اب مومن عورتوں کو ان آداب و احکام کی پابندی کا حکم فرمایا جارہا ہے جن سے وہ اپنی ناموس اور آبرو کو محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرما رہے ہیں کہ آپ مومن عورتوں کو حکم دیجئے کہ

1- وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھا کریں۔

2- اپنے ستر کی جگہوں کی حفاظت کیا کریں۔

3- اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں بجز اس کے جس کے ظاہر کیے بغیر چارہ نہیں

4- اپنی اوڑھنیوں سے اپنے سینوں کو ڈھانپ لیا کریں۔

5- زمین پر پاؤں اس طرح نہ ماریں جن سے ان کی مخفی زینت و آرائش ظاہر ہو۔

6- درمیان میں ان لوگوں کا ذکر کر دیا گیا جن کے سامنے زینت کا اظہار ممنوع نہیں

یہ چھ ارشاداتِ ربانی ہیں جو اس آیت میں ذکر کیے گئے ہیں۔ اب ذرا ان کا تفصیلی تذکرہ سماعت فرمایئے تا کہ وہ قواعد وضوابط آپ کے سامنے واضح ہو جائیں جن پر کاربند ہونا اسلامی معاشرہ کو پاکیزہ رکھنے کیلئے ہر مرد اور عورت پر لازمی ہے۔ عورتوں کو بھی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا جارہا ہے کہ وہ ان چیزوں کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھیں جن کی طرف دیکھنا ممنوع ہے۔

اس مسئلہ کو امام فخر الدین رازی نے خاص ترتیب سے لکھا ہے جس سے مسئلہ کے سارے گوشے واضح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں انہیں کا اتباع کرتے ہوئے اس مسئلہ کو پیش خدمت کرتا ہوں۔

''آپ فرماتے ہیں کہ جسم کا وہ حصہ جس کو ظاہر کرنا یا جس کو دیکھنا ممنوع ہے چار طرح سے ہے۔

1- مرد کے جسم کا وہ حصہ جو دوسرے مرد کو دیکھنا ممنوع ہے۔

2- عورت کے جسم کا وہ حصہ جو دوسری عورت کو دیکھنا ممنوع ہے۔

3- عورت کے جسم کا وہ حصہ جو مرد کو دیکھنا ممنوع ہے۔

4- مرد کے جسم کا وہ حصہ جس کی طرف عورت کو دیکھنا جائز نہیں۔

1- مرد کے جسم کا وہ حصہ جس کی طرف دوسرا مرد نہیں دیکھ سکتا، ناف سے لیکر گھٹنوں تک ہے۔ امام صاحب کے نزدیک گھٹنوں کو دیکھنا جائز نہیں اور ران کو دیکھنا بطریقہ اولیٰ ممنوع ہوگا۔

حضرت حذیفہؓ ایک دن مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ران سے کپڑا سرک گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''غطّ فخذک فانها من العورة'' اپنی ران کو ڈھانپ لو کیونکہ یہ بھی ستر ہے۔ حضرت سیدنا علیؓ کو بھی ارشاد فرمایا ''لا تبرز فخذک ولا تنظر الی فخذحی ولا میّت'' اپنی رانوں کو ظاہر نہ کرو اور کسی مردہ یا زندہ کی ران کی طرف مت دیکھو۔

2- عورت کے جسم کا وہ حصہ جو کسی عورت کو دیکھنا جائز نہیں وہ بھی یہی ہے یعنی ناف سے لے کر گھٹنوں تک نہیں دیکھ سکتی۔ باقی جسم کا دیکھنا جائز ہے لیکن اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو یہ بھی ممنوع ہے۔ غیر مسلم عورت مسلمان عورت کے صرف ان حصوں کو دیکھ سکتی ہے جو مرد دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ سالار لشکر کی طرف لکھا

"انّہ بلغنی ان نساء اھل الذمّۃ یدخلن الحمامات مع نساء المسلمین فامتنع من ذالک وحل دونہ فانہ لا یجوز ان تری الذمیۃ عریۃ المسلمۃ"

یعنی مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ ذمی عورتیں مسلمان عورتوں کے ساتھ حمام میں جاتی ہیں اس سے روک دو کیونکہ کسی ذمیہ عورت کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ مومن عورت کے ستر کو دیکھے۔

3- عورت کے بدن کا وہ حصہ جو مرد کو دیکھنا ممنوع ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام موصوف لکھتے ہیں: وہ عورت اجنبی ہوگی، محرم ہوگی یا بیوی ہوگی۔ اگر وہ آزاد نامحرم عورت ہے تو اس کا سارا بدن ہاتھ اور چہرہ کے سوا ستر ہے، کیونکہ وہ بیع شراء اور لین دین کے وقت چہرہ اور ہاتھوں کو کھولنے پر مجبور ہوتی ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں چہرہ اور ہاتھوں کی طرف دیکھنے کی تین صورتیں ہیں:

الف۔ چہرہ دیکھنے کی کوئی غرض نہ ہو، فتنہ کا اندیشہ بھی نہ ہو۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے، دیکھنے کی غرض کوئی نہیں لیکن فتنہ کا اندیشہ ہے۔

ج۔ تیسری صورت یہ ہے کہ غرض بھی ہے اور فتنہ کا اندیشہ بھی ہے۔

پہلی صورت میں اجنبیہ کی طرف بلا مقصد قصد و ارادہ سے دیکھنا جائز نہیں۔ اگر ایک دفعہ نگاہ پڑ جائے تو دوسری مرتبہ آنکھیں پھیر لے۔ نگاہیں نیچی کر لے۔ حضرت امام صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو ایک مرتبہ جائز اور بار بار دیکھنا منع ہے۔

وقیل یجوز مرّۃً اذا لم یکن محل فتنۃ وبہ قال ابو حنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ ولا یجوز ان یکرّر النظر الیھا۔

دوسری صورت میں جبکہ اجنبیہ کے دیکھنے کا مقصد ہو مثلاً اگر کوئی شخص کسی

عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کیلئے اس عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز ہے۔ارشادِ نبوی ہے

"اذا خطب احدکم المرأة فلا جناح علیه ان ینظر الیها"

فرمایا پہلے دیکھ لو اس طرح تمہارے رشتہ کی بقا کا زیادہ امکان ہے۔تیسری صورت میں جبکہ اجنبیہ کی طرف محض شہوت کے خیال سے دیکھے تو اس وقت اس کے کسی حصہ جسم کو دیکھنا بھی ممنوع ہے۔البتہ ڈاکٹر اور طبیب مریضہ کے جسم کے کسی حصہ کو بھی دیکھ سکتا ہے جبکہ اس کا دیکھنا علاج کیلئے ضروری ہو لیکن مستورات کے علاج کیلئے ایسے طبیب اور ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے جو امین ہو۔اسی لیے امام رازی فرماتے ہیں

یجوز الطبیب الامین ان ینظر الیها للمعالجة

اگر عورت ڈوب رہی ہو یا اسے آگ لگ گئی ہو تو اسے بچانے کیلئے اس کے جسم کے کسی حصہ کو ہاتھ لگانا یا اس کی طرف دیکھنا ممنوع نہیں کیونکہ اس وقت اس کی جان بچانا فرض ہے۔یہ احکام اس عورت کے تھے جو اجنبیہ اور نامحرم ہو۔

محرم عورت کے متعلق امام ابوحنیفہ کا ارشاد یہ ہے کہ جسم کے وہ حصے جو کام کاج کرتے وقت عام طور پر کھل جاتے ہیں فقط ان کی طرف دیکھنا جائز ہے۔

وعورتها مایبدو عند المهنة وهو قول ابی حنیفة رحمة الله علیه

اور اپنی بیوی کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس کی طرف دیکھنا خاوند کیلئے ممنوع ہو

4- عورت نامحرم مرد کے ناف اور گھٹنوں کے درمیان نہیں دیکھ سکتی۔بعض نے یہ کہا ہے کہ عورت مرد کا صرف چہرہ اور ہاتھ دیکھ سکتی ہے۔اس کے جسم کے باقی حصوں کی طرف نہیں دیکھ سکتی لیکن الاول اصح پہلا قول صحیح ہے۔یہ اس وقت کا حکم ہے جب فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اور اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو مرد کے کسی حصہ کی طرف نہ دیکھے حتیٰ کہ مرد

کے چہرہ کی طرف بار بار دیکھنا بھی جائز نہیں۔

ولا یجوز لها قصد النظر عند خوف الفتنة ولا تكرير النظر الى وجهه ؎

ابوالعالیہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ یہاں ان الفاظ سے ستر کی جگہ کو ڈھانپنا مراد ہے لیکن امام رازیؒ اور دیگر علماء فرماتے ہیں کہ یہ تخصیص ضعیف ہے لانه تخصيص من غير دلالة

ظاہر آیت کا مقتضاء یہ ہے کہ یہ اس چیز سے حفاظت کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہے اس میں بدکاری، مس کرنا اور دیکھنا سب داخل ہیں۔

وہ زینت جو ظاہر ہے جس کے اظہار کی ممانعت نہیں اس کے متعلق حضرات ابن عباس، مجاہد، عطاء ابن عمرؓ اور انس رضی اللہ عنہم کا قول ہے ماكان فى الوجه والكف الخضاب والكحل یعنی وہ زینت جو چہرہ اور ہتھیلیوں میں ہوتی ہے جیسے خضاب اور سرمہ۔

حسن بصری کہتے ہیں وجهها وما ظهر من ثيابها چہرہ اور وہ کپڑے جو ظاہر ہوں۔ سعید بن المسیّب نے فرمایا وجهها متاظهر چہرے کا وہ حصہ جو ظاہر ہو۔ قال ابراهيم الزينة الظاهرة الثياب اس سے مراد لباس ہے۔ یہ مختلف اقوال لکھنے کے بعد امام ابوبکر الجصاص لکھتے ہیں "قال اصحابنا المراد الوجه والكفان لان الكحل زينة الوجه والخضاب والخاتم زينة الكف" یعنی علماء احناف کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں کیونکہ سرمہ چہرے کی اور خضاب اور انگوٹھی ہتھیلیوں کی زینت ہیں۔ ؎

لیکن خیال رہے کہ یہ اباحت اس وقت ہے جبکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو ورنہ چہرہ اور ہتھیلی کو دیکھنا بھی حرام ہے۔ علامہ ابن حیان الاندلسی لکھتے ہیں قال ابن خويز

منداد اذا كانت جميلة وخيف من وجهها وكفها الفتنة فعليها ستر ذالک اور اگر عورت خوبرو ہو، اور اس کے چہرے اور ہاتھوں کی طرف دیکھنا فتنے کا باعث ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کو ظاہر نہ کرے ۶

آج جبکہ لوگوں کی آنکھوں میں حیا نہیں رہی، ہر طرف آوارگی اور بیہودگی کا دور دورہ ہے ہر اس شخص پر جس کی نگاہوں میں عفت و عصمت کی کوئی قدر و قیمت ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی جوان بہو بیٹیوں کو بے پردہ باہر نکلنے سے روکے اور انہیں نامحرموں کے سامنے بے تکلفی سے آنے کی اجازت نہ دے۔

پہلے عورتیں سر پر جو کپڑا ڈالتی تھیں ان کے پلو اپنی پشت پر لٹکا دیا کرتی تھیں۔ اس طرح ان کی گردن، کان، سینہ وغیرہ ظاہر رہتے تھے۔ اس آیت نے یہ حکم دیا کہ سر پر جو اوڑھو اس کے پلوں کو پشت پر پیچھے نہ پھینک دو بلکہ انہیں اپنے گریبانوں پر ڈال دو تا کہ تمہارے سینے، گردن وغیرہ لوگوں کی نظروں سے چھپ جائیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی اور مردوں نے جا کر اپنی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کو سنائی تو اس وقت انہوں نے اس کی تعمیل کی اور اپنی ایک پرانی عادت کو چشم زدن میں چھوڑ کر اطاعت و انقیاد کی نادر مثال پیش کی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس آپ کی بھتیجی حضرت حفصہ بن عبدالرحمٰن آئیں۔ انہوں نے اس وقت ایک باریک اوڑھنی سر پر ڈالی ہوئی تھی۔ آپ کو یہ چیز سخت ناگوار گزری اور فرمایا انما يضرب بالكثيف الذي يستر ا... بیٹی! ایسی اوڑھنی اوڑھنے کا حکم ہے جو موٹی ہو اور جس سے پردہ کا مقصد پورا ہو۔

دختران اسلام ذرا خود ہی انصاف کریں کہ جو باریک دوپٹے وہ اوڑھتی ہیں اور جس طرح انہیں سر کی بجائے اپنے کندھوں پر ڈال لیتی ہیں اور سینہ تان کر بازار میں چلتی ہیں ان کا یہ طریقہ کار اسلام کی تعلیمات کے کتنا منافی ہے۔ علامہ اقبال نے کتنے درد بھرے انداز میں دختران ملت کو عریانی اور بے پردی سے باز آنے کی تلقین کی ہے

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا
مسلمان رانہ زیبد کافری ہا

منہ دل برجمالِ غازہ پرورد
بیا موز نگاہ غارتگری ہا

پھر فرماتے ہیں:

اگر پندے زدر ویشے پذیری
ہزار امت بمیرد تو نہ میری

بتولے باش و پنہاں شواز یں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

یعنی اگر تو ایک درویش کی نصیحت کو قبول کر لے تو ہزاروں امتیں فنا ہو سکتی ہیں لیکن تو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ حضرت فاطمہ زہرا بتولِ جنت کا شیوہ اختیار کر اور زمانہ کی نگاہوں سے چھپ جا تا کہ تیری آغوش میں شبیر جیسا فرزند پرورش پا سکے۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ سر، گردن اور سینہ کا چھپانا فرض ہے۔ ے

عورت کا چہرہ پردہ میں شامل ہے یا نہیں

مسلم امہ کے اصحاب فکر و دانش کے درمیان اس مسئلہ پر بحث تو ہوتی رہی ہے کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ پردے میں شامل ہیں یا نہیں لیکن پردہ کے خلاف باقاعدہ تحریک انیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی۔ جب مسلم معاشرے کے کمزور الاعتقاد لوگوں نے خود کو مغربی تمدن کے رنگ میں رنگنے کیلئے اغیار کی بولی بولنا شروع کر دی اور فقہاء و ائمہ کے لٹریچر سے اپنے موقف کے حق میں دلائل تلاش کرنے شروع کر دیئے اور بالآخر اپنی ساری قوت استدلال عورت کی آزادی کیلئے صرف کرنا

شروع کر دی اور حیرت اس بات پر ہے کہ آزادی نسواں کی راہ میں حجاب کو رکاوٹ سمجھا گیا حالانکہ حجاب یا پردہ عورت کے تقدس کی علامت ہے جو اسکو للچائی ہوئی نگاہوں کے تیروں سے محفوظ رکھتا ہے۔

مسلمان فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اس حد تک تو اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض خواتین کے چہرے کے پردہ کو قرآنی آیات کی تفسیر اور احادیث نبویہ کی روشنی میں واجب سمجھتے ہیں جبکہ بعض کے نزدیک چہرے اور ہاتھوں کے سوا عورت کے باقی جسم کا پردہ واجب ہے۔ جبکہ چہرے اور ہاتھوں کا پردہ مستحب ہے۔ اگر بات صرف عورت کے چہرے کے پردہ کو مستحب ثابت کرنے کی حد تک ہوتی تو قابل قبول تھی۔ مگر ہمارے بعض علماء و اسکالرز نے وجوب کی نفی اور استحباب کے اثبات میں دلائل دیتے ہوئے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو عصر حاضر میں مردوں سے چہرہ چھپانے کی گویا ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور چہرہ کے پردہ کے بارے میں مروی تمام احادیث کی اسناد کو ضعیف ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ میرے پیش نظر اسوقت دو صاحب علم مؤلفین کی کتب ہیں جن میں سے ایک لاہور کے نامور محقق مفتی غلام سرور قادری صاحب کی کتاب ''پردہ کی شرعی حیثیت'' اور دوسری ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب ''مرد اور عورت'' سماجی تعلق کے اسلامی آداب ہے۔ ان دونوں حضرات نے عورت کے چہرے اور ہاتھوں کو پردہ سے خارج قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ دور میں مسلم خواتین بلا ضرورت بھی چہرے اور ہاتھوں کو بغیر پردہ کے رکھ سکتی ہیں۔ مفتی غلام سرور قادری صاحب اپنی کتاب پردہ کی شرعی حیثیت میں آیات پردہ کی تفسیر میں بعض مفسرین کی آراء لکھنے کے بعد چند احادیث نقل کرتے ہیں جن کی تعبیر میں وہ یہی ثابت کرتے ہیں کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں خواتین کا چہرہ پردے میں شامل نہیں تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد فاروق

خان اپنی کتاب ''مرد وعورت'' کے صفحہ نمبر 43 پر لکھتے ہیں۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے ایک خاتون اپنے شوہر کے علاوہ اپنے قریب ترین حلقے میں لباس کے ضمن میں کیا احتیاطیں ملحوظ رکھے۔ جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اس قریب ترین حلقے کے سامنے زیب وزینت کا رکھنا جائز ہے تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قریب ترین حلقے میں ایک خاتون اپنے اس لباس کے ساتھ رہ سکتی ہے جس میں وہ کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرے۔ مثلاً اس کیلئے سر چھپانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پائنچے اور بازو اوپر اٹھا سکتی ہے۔'' 8

اندازہ کریں کہ فاضل مؤلف چہرہ اور ہاتھوں کے علاوہ بازو اور پنڈلیوں کو بھی پردہ سے خارج قرار دے رہے ہیں۔

عورت کے پردہ سے متعلق قرآنی حکم

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۃ نور کی آیت نمبر 31 میں ارشاد فرمایا:

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ ۪ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: آپ حکم دیجئے ایماندار عورتوں کو کہ وہ نیچی رکھا کریں اپنی نگاہیں اور حفاظت کیا کریں اپنی عصمتوں کی اور نہ ظاہر کریں اپنی آرائش کو مگر جتنا خود بخود نمایاں ہو اس سے اور ڈالیں رہیں اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر اور نہ ظاہر ہونے دیں

اپنی آرائش کو مگر اپنے شوہروں کیلئے یا اپنے باپوں کیلئے یا اپنے شوہروں کے باپوں کیلئے یا اپنے بیٹوں کیلئے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کیلئے یا اپنے بھائیوں کیلئے یا اپنی ہم مذہب عورتوں پر یا اپنی باندیوں پر یا اپنے ایسے نوکروں پر جو عورت کے خواہشمند نہ ہوں یا ان بچوں پر جو ابھی تک عورتوں کی شرم والی چیز پر آگاہ نہیں ہوئے اور نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں زمین پر تاکہ معلوم ہو جائے وہ بناؤ سنگھار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں اور رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو تاکہ تم (دونوں جہانوں میں) بامراد ہو جاؤ۔ (ضیاء القرآن)

اس آیت کریمہ سے مفسرین کرام نے یہ ثابت کیا ہے کہ عورت کے جسم کے کون کون سے حصے پردہ میں شامل ہیں اور کن کا چھپانا لازمی ہے۔ اس بات پر سب ائمہ وفقہاء متفق ہیں کہ عورت کا اپنے ہاتھ اور چہرے کے علاوہ باقی جسم کو اجنبی مردوں سے چھپانا ضروری ہے۔

تاہم عورت کے چہرہ اور ہاتھ کے پردہ کے بارے میں جو اختلاف ہے میں یہاں اسے لکھنے کے بعد اپنا تجزیہ پیش کرتا ہوں۔

صحابہ وتابعین کے نزدیک زینت ظاہرہ کا معنی [illegible]

حضرت ابن مسعود، ابراہیم نخعی اور حسن بصری رضوان اللہ علیہم [illegible] نزدیک زینت ظاہرہ سے مراد وہ کپڑے ہیں جن [illegible] مثلاً برقع یا چادر۔ جبکہ حضرت ابن عباس [illegible] جبیر اور اوزاعی رضوان اللہ علیہم [illegible] اور ہاتھ ہیں اور وہ اسباب زینت بھی [illegible] میں عادتاً داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کی مہندی، انگوٹھی [illegible] حضرت سعید بن مسیب کے نزدیک صرف چہرہ مستثنیٰ ہے۔ [illegible]

سے ان کی تائید میں منقول ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چہرہ چھپانے کیطرف مائل ہیں۔ ان کے نزدیک زینت ظاہرہ سے مراد ہاتھ اور چوڑیاں، کنگن اور انگوٹھیاں مراد ہیں۔ مسعود بن مخرمہ اور قتادہ ہاتھوں کو ان کی زینت سمیت کھولنے کی اجازت دیتے ہیں مگر چہرے کے باب میں ان کے اقوال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے چہرے کی بجائے وہ صرف آنکھیں کھولنے کو جائز رکھتے ہیں۔ [10]

جن مفسرین کے نزدیک چہرہ پردے میں شامل نہیں

پہلے ذیل میں ان آئمہ کی آراء پیش کی جاتی ہیں جو عورت کے چہرے اور ہاتھ کو پردہ میں شامل نہیں سمجھتے۔

(1)...... مذکورہ بالا آیت سے استدلال کرتے ہوئے علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ متوفی 310ھ نے اپنی تفسیر طبری میں لکھا ہے قرآن میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ عورتیں اپنی خوبصورتی ظاہر نہ کریں مگر ''اِلَّامَا ظَهَرَ مِنْهَا'' سوائے اس کے جو خود ظاہر ہے۔ اس کا چھپانا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''الظاهر منها الكحل و الخدان'' جو خود ہی ظاہر ہے۔ وہ سرمہ اور دورخسار ہیں۔ امام ابن جریر طبری نے حضرت سیدنا سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل فرمایا۔ الا ماظهر منها اى قال الوجه و الكفان یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمان مگر جو خود ہی ظاہر ہے۔ کی تفسیر میں انہوں نے فرمایا کہ اس سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔ یعنی چہرے اور دونوں ہاتھوں کا چھپانا ضروری نہیں ہے۔ علامہ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان بھی نقل کیا ہے۔ الزينة الظا هرة الوجه و كحل العين و خضاب الكف و الخاتم ترجمہ: زینت ظاہرہ جسکا چھپانا ضروری نہیں ہے چہرہ ہے اور آنکھ کا سرمہ اور ہاتھ کی مہندی

اور انگوٹھی ہے۔ ان کا پردہ ضروری نہیں ہے۔ علامہ طبری اپنی تفسیر کے صفحہ نمبر 4 پر صحابہ، تابعین اور مجتہدین کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی رائے لکھتے ہیں۔ ''ان تمام اقوال میں حق کے قریب تر اس شخص کا قول ہے جس نے کہا کہ زینت ظاہرہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں۔'' [11]

(2)...... علامہ ثناء اللہ پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں چہرے اور دونوں ہاتھوں کا استثنا لکھنے کے بعد لکھا ہے چاروں ائمہ کے نزدیک چہرے کا پردہ ضروری نہیں ہے۔

(3)...... ان کے علاوہ امام ابو بکر الجصاص نے لکھا ہے الا ما ظھر منھا المراد الوجه والکفان ان الوجه والکفین من المرأة لیسا بعورة مگر جو خود ہی ظاہر ہے اور اسکا چھپانا ضروری نہیں ہے۔ اس سے مراد عورت کا چہرہ اور دونوں ہاتھ مراد ہیں۔ بلاشبہ عورت کے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا پردہ نہیں ہے۔'' [12]

(4)...... ان کے علاوہ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے ''فجمیع بدنھا عورة ولا یجوزله ان ینظر الی شیئی منھا الاالوجه والکفین۔ ترجمہ: عورت کے تمام بدن کا پردہ ہے۔ غیر محرم مرد کیلئے جائز نہیں کہ اس کے جسم کے کسی حصے کیطرف دیکھے سوائے چہرے اور دونوں ہاتھوں کے۔'' [13]

(5)...... علامہ بغوی نے لکھا ہے ''عورت کی وہ مخفی زینت جسکا ظاہر کرنا عورت کیلئے جائز نہیں نہ نماز میں اور نہ ہی نماز کے علاوہ دیگر اوقات میں وہ چہرہ اور ہاتھ کے سوا اور باقی جسم ہے۔ [14]

(6) وہ آئمہ تفاسیر جن کے نزدیک چہرہ پردے میں شامل ہے

(i) صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے لکھا ہے'' کہ اگر چہ

شہوت کیساتھ عورت کے چہرے اور ہاتھوں کو دیکھنا ممنوع ہے اور بغیر شہوت کے دیکھنا جائز ہے مگر فساد کے اس زمانہ میں کسی سے بھی ممکن نہیں کہ وہ کسی غیر محرم عورت کو دیکھے اور اس پر شہوت کا غلبہ نہ ہو۔ لہٰذا اس کی بالکل ممانعت ہے۔" ۱۵

(ii) علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی گجراتی نے لکھا ہے "معلوم ہوا کہ جیسے مرد اجنبی عورت کو نہ دیکھے ایسے ہی عورت اجنبی مرد کو نہ دیکھے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نابینا مرد کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی وہ تو نابینا ہیں۔ فرمایا "افعمیا وان انتما" کیا تم دونوں بھی نابینا ہو" ۱۶

(iii) مفتی اعظم پاکستان علامہ سید ابوالبرکات اپنے رسالے "القول الصواب فی مسلۃ الحجاب" کے صفحہ نمبر 8 پر بحوالہ عالمگیری لکھتے ہیں "النظر الی الاجنبیات منقول یجوز النظر الی مواضع الزینۃ الظاهره وذلک الوجه والکف فی ظاهر الروایۃ کذا فی الذخیره وان غلب علی ظنه انه یشتهی فهو حرام کذافی الینا بیع"

ترجمہ: اجنبی عورتوں کی طرف دیکھنے کے سلسلہ میں ہم کہتے ہیں کہ زینت ظاہرہ کی جگہوں کی طرف دیکھنا جائز ہے اور وہ (زینت ظاہرہ) چہرہ اور ہاتھ ہیں۔ لیکن اگر غلبہ شہوت کا گمان ہو تو پھر (چہرے اور ہاتھ) کو دیکھنا حرام ہے۔" ۱۷

(iv) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورہ احزاب میں ارشاد فرمایا يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾ ۱۸

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مذکورہ بالا آیت کریمہ کے ضمن میں لکھتے ہیں "یہ آیت خاص چہرے کو چھپانے کیلئے ہے۔ جلابیب جمع ہے جلباب کی جس کے معنی چادر کے ہیں۔ ادناء کا معنی ارخاء یعنی لٹکانے کے ہیں۔ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ

جَلَابِيبِهِنَّ کا لفظی ترجمہ ہوگا'' کہ اپنے اوپر اپنی چادروں میں سے ایک حصہ لٹکا لیا کریں'' یہی مفہوم گھونگھٹ ڈالنے کا ہے۔ مگر اصل مقصود وہ خاص وضع نہیں جس کو عرف عام میں گھونگھٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ چہرے کو چھپانا مقصود ہے۔ خواہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب سے یا کسی اور طریقے سے۔ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان عورتیں اس طرح مستور ہو کر نکلیں گیں تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شریف عورتیں ہیں بے حیا نہیں۔ اس لیے کوئی ان سے تعرض نہ کرے گا۔ قرآن مجید کے تمام مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ حضرت ابن عباس اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں'' اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا کریں۔

امام محمد بن سیرین نے حضرت عبیدہ بن سفیان بن الحارت الحضرمی سے دریافت کیا کہ اس حکم پر عمل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ انہوں نے خود چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی، ناک، اور ایک آنکھ کو چھپا کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی ہے۔ 19

(v) حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں'' جلابیب جمع ہے اس کا واحد جلباب ہے اور جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو سارے جسم کو ڈھانپ لے۔ انه الثوب الذی یستر جمیع البدن علامہ زمخشری ''یدنین'' کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں یر خینها علیهن ویغطین بها وجوههن واعطافهن یعنی اپنی چادروں کو اپنے اوپر ڈالو۔ اپنے چہرے اور کندھوں کو چادر سے چھپالو۔ علامہ زمخشری کے اس قول سے معلوم ہوگیا کہ لغوی طور پر یدنین علیهن کا مفہوم یہ ہے کہ چادر کو اپنے اوپر اسطرح ڈالا جائے کہ سارا جسم ڈھک جائے۔ کندھے اور چہرہ بھی برہنہ نہ رہے۔ علامہ ابوحیان لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں اندلس میں مسلم خواتین اس طرح پردہ کرتی ہیں کہ سارا چہرہ چھپا ہوتا ہے۔ صرف ایک آنکھ کھلی ہوتی

ہے۔ و کذا عادۃ بلاد لاندلس لا یظھر من المراۃ الا عینھا الوحدہ (بحر)

یہاں واضح طور پر امہات المومنین اور دختران رسالت مآب ﷺ کو خصوصاً اور تمام مسلمان عورتوں کو عموماً حکم دے دیا گیا۔ کہ وہ باہر نکلیں تو بڑے وقار اور آبرو مندانہ طریقہ سے نکلیں۔ ایک چادر سے اپنے سارے جسم اور اکثر چہرہ کو ڈھانکا ہوا ہو۔ آج ہمارے معاشرے کا جو حال ہے اور نوجوان عورتوں نے جسطرح شرم وحیاء کی چادر کو اتار کر پھینک دیا ہے۔ ننگے سر، نیم عریاں لباس میں جسطرح وہ بن سنور کر بازاروں میں پھرتی اور عام محفلوں میں شرکت کرتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر کون یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ دختران اسلام ہیں۔ ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بنو تمیم قبیلہ کی چند عورتیں حاضر ہوئیں۔ انہوں نے باریک لباس پہنا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر ام المومنین نے فرمایا "ان کنتن المؤمنات فلیس ھذا بلباس المؤمنات وان کنتن غیر مومنات فمتعھن (قرطبی) یعنی اگر تم مومن عورتیں ہو تو سن لو یہ لباس مومن خواتین کا نہیں ہوتا اور اگر تم مومن نہیں ہو تو پھر جو چاہو کرو۔ ۲۰

(vi) علامہ نیشا پوری لکھتے ہیں "ابتدائے اسلام میں عورتیں زمانہ جاہلیت کی طرح قمیض اور دوپٹے کیساتھ نکلتی تھیں اور شریف عورتوں کا لباس ادنیٰ درجہ کی عورتوں سے مختلف نہ تھا۔ پھر حکم دیا گیا کہ وہ چادریں اوڑھیں اور اپنے سر اور چہرے کو چھپائیں تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ شریف عورتیں ہیں۔ فاحشہ نہیں۔ ۲۱

(vii) علامہ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ یعنی وہ اپنی حاجات کیلئے باہر نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنے چہروں اور جسموں کو چھپالیں۔ یہاں لفظ "من" تبعیض کیلئے ہے۔ یعنی چادروں کے ایک حصہ کو منہ پر ڈالا جائے اور ایک حصہ کو جسم پر لپیٹ دیا جائے ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ یعنی اس سے ان کے اور لونڈیوں اور مغنیات کے درمیان تمیز ہو جائے گی۔ فَلَا يُؤْذَيْنَ اور مشتبہ چال چلن کے لوگ ان

سے تعرض کی جرأت نہ کر سکیں گے۔" ۲۲

راقم الحروف کا تجزیہ

صحابہ وتابعین اور آئمہ تفاسیر کی آراء کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگرچہ عورت کو شدید ضرورت کے وقت چہرہ سے پردہ ہٹانے کی اجازت ہے تاہم اسکے لیے افضل، بہتر اور مستحب عمل یہی ہے کہ وہ فساد، شر انگیزی اور اخلاقی بے راہروی کے اس دور میں اپنے چہرے کو غیر محرم مردوں سے چھپائے کیونکہ عورت کے چہرے کا ڈھانپا ہوا ہونے میں نقصان کم اور فائدہ زیادہ ہے جبکہ چہرے کے پردے کے نہ ہونے میں نقصان زیادہ اور فائدہ کم ہے۔ لہٰذا ایک سمجھ دار اور سلیقہ شعار خاتون ہمیشہ کم نقصان اور زیادہ فائدہ والے عمل کو ہی اختیار کرتی ہے۔

جن آئمہ وفقہاء کے نزدیک چہرہ اور ہاتھ پردہ میں شامل نہیں وہ بھی اس استثناء کو مباح سمجھتے ہیں نہ کہ واجب۔ لہٰذا اس استثناء کا سہارا لیکر یہ کہنا کہ چہرہ کے پردہ میں نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یا چہرہ فطرتی طور پر کھلا رہنا ضروری ہے۔ یہ بات بالکل غیر معقول اور نامناسب ہے کیونکہ حقیقت میں چہرہ ہی سب سے زیادہ مرکز توجہ ہوتا ہے۔ جسمانی خوبصورتی کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہی ہوتا ہے۔ اگر چہرہ باپردہ ہو تو ہوسناک نگاہیں اسکا پیچھا نہیں کرتیں جبکہ بے پردہ چہرہ تو ہر کسی کو دعوت نظارہ دے رہا ہوتا ہے اور اس دور میں جبکہ شرم وحیا اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکل چکا ہے ہمارے صاحبان علم ابھی تک اس زعم میں مبتلا ہیں کہ بھلا چہرہ کے بلا حجاب رہنے سے کون سی قیامت برپا ہو جائے گی۔ میرے نزدیک قیامت ہی نہیں بلکہ قیامت کبریٰ تو ہر روز برپا ہوتی ہے۔ جب کسی حسینہ کا ناکام عاشق اپنی محبوبہ کی منگنی دوسری جگہ ہو جانے کی بنا پر اسکے چہرے پر تیزاب ڈال کر وحشنا کی کا وہ مظاہرہ کرتا ہے جسکے سامنے کئی قیامتیں لرز اٹھتی ہیں۔ ایسے واقعات اب شاذ نہیں ہیں بلکہ یومیہ اخبارات

ایسے واقعات سے بھری ہوتی ہیں۔

عہد رسالت مآب ﷺ میں جب لوگوں کا ایمان صحبت نبوی کی برکات سے بہت مضبوط ہوتا تھا شاید اسی وجہ سے اس دور میں چہرے کا پردہ ضروری بھی نہیں تھا مگر اس کے باوجود اسلام سد ذرائع کا حکم دیتا ہے یعنی ان ذرائع (Sources) کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے جہاں سے برائی کے پھوٹنے کا ذرا بھی خدشہ لاحق ہو۔ جیسے بخاری و مسلم میں ایک روایت ملتی ہے کہ ''ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے کہ خیمے سے ایک خاتون نکل کر آپ ﷺ کے سامنے آ کر کوئی مسئلہ پوچھنے لگی اس وقت ایک نوجوان فضل بن عباس رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کے پیچھے سوار تھے۔ چنانچہ وہ اس خاتون کی طرف دیکھنے لگے تو نبی کریم ﷺ نے فضل رضی اللہ عنہ کی ٹھوڑی کو پکڑ کر اس کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیا'' اگرچہ اس روایت کو بھی بعض احباب نے چہرے کو بلا حجاب رکھنے کی تائید میں پیش کیا ہے لیکن میرا استدلال اس روایت سے یہ ہے کہ جب خاتون اچانک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے آ گئی تو نبی علیہ السلام سے پردہ ضروری نہیں تھا رہ گیا۔ فضل بن عباس کا مسئلہ تو ان سے غض بصر کے معاملہ میں کوتاہی ہو رہی تھی تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کا چہرہ پھیر کر اس کا ازالہ فرما دیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وہ عورت چونکہ بے نقاب تھی لہٰذا چہرے کا پردہ ضروری نہیں ہے بالکل ایک انہونی بات ہے کیونکہ موجودہ دور میں اس مسئلہ کا بہتر حل یہی ہے کہ اگر خاتون کا چہرہ باپردہ ہوگا تو پھر بے احتیاطی کا دروازہ خود ہی بند ہو جائے گا۔ بشرطیکہ چہرے کا پردہ بھی مکمل ہو نہ یہ کہ اس نقاب سے بے پردگی اور فیشن کی جھلک نظر آ رہی ہو۔

مقصود کلام یہی ہے کہ خواتین کے چہرے کا پردہ موجودہ دور میں انکی عزت و عصمت کا زیادہ محافظ ہے کیونکہ عموماً بے پردہ عورت ہر کسی کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے جبکہ باپردہ عورت کو دیکھ کر شریر لوگ بھی اپنی نگاہیں نیچی کر لیتے ہیں اور چہرہ ہی

درحقیقت کسی عورت کے حسن یا بدصورتی کی نشاندہی کرتا ہے۔فرض کیجئے کہ کسی لڑکے نے کسی لڑکی کو دیکھ کر اس سے منگنی کرنے کی حامی بھرنی ہے اب ایک صورت یہ ہے کہ وہ لڑکی نقاب میں پورے شرعی پردہ کے ساتھ اس لڑکے کے سامنے سے گزر جائے جبکہ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ صرف اس لڑکی کے چہرہ کو دیکھ لے جبکہ باقی جسم نہ دیکھ سکے سچ بتایئے کہ اس شخص کے فیصلے پر کون سی صورت اثر انداز ہوگی۔یہی نہ کہ صرف وہ لڑکی کا چہرہ دیکھ کر نتیجہ کن صورتحال پر پہنچ سکتا ہے لیکن اگر وہ چہرے کے نقاب کے ساتھ دس مرتبہ بھی اسکے سامنے سے گزرے تو شاید وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہے۔مطلب یہ کہ پورے جسم میں چہرہ سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے۔اگر وہ باپردہ ہوگا تو نفسانی نگاہوں کے تیروں سے محفوظ رہے گا جبکہ بغیر پردہ کے گھر سے نکلنے والی عورت کو حدیث پاک میں شیطان کے روپ سے جو تشبیہ دی گئی ہے تو کیا چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ جسم کا اور بھی کوئی حصہ ہے جس کے پردہ کے بغیر وہ گھر سے نکلے گی اس حدیث سے واضح مطلب یہی نکل رہا ہے کہ اگر چہرہ کے پردہ کے بغیر گھر سے نکلے تو تباہی تو شیطان کے روپ میں ہوگی وگرنہ خالی کپڑے تو دنیا کی ہر تہذیب میں عورتیں پہنتی ہیں۔لہٰذا ثابت ہوا کہ بدنگاہی (جو حدیث پاک کی رو سے شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے) کا شکار سب سے زیادہ وہ عورت ہوتی ہے جو چہرہ کے پردہ کے بغیر ہوتی ہے۔

اب میں ان صورتوں کو بیان کرتا ہوں جہاں عورت چہرے سے پردہ ہٹا سکتی ہے۔فقہاء کے نزدیک معالج یا ڈاکٹر کے سامنے عورت بوقت ضرورت چہرہ نقاب کے بغیر رکھے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ فقہی قاعدہ ہے کہ ''الضرورات تبیح المحظورات'' یعنی ضرورتیں ناجائز کاموں کو (بوقت ضرورت) مباح قرار دیتی ہیں لہٰذا علاج کی غرض سے عورت کا چہرے سے پردہ ہٹانا جائز ہے اسی طرح استاد یا معلم

سے حصول علم کے وقت اگر چہرہ بے نقاب ہو تو اس میں بھی حرج نہیں ہے اگرچہ موجودہ دور میں اس مسئلہ میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔اسی طرح عمر رسیدہ خواتین چہرہ کے پردہ سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کی جوانی کی چھاؤں کا ڈھل جانا فتنہ کے اندیشے کو کم کر دیتا ہے۔لہٰذا انہیں رخصت دی گئی ہے مگر افسوس سے لکھ رہا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی عموماً ماں اور بیٹی اکٹھی سفر کر رہی ہوں تو بوڑھی ماں نے برقعہ اور نقاب اوڑھا ہوتا ہے جبکہ جوان بیٹی ساتھ بغیر پردہ کے جارہی ہوتی ہے جو شریعت کے حکم اور مصلحت کے بالکل خلاف ہے۔

ہمارے فقہاء نے بغیر شہوت کے عورت کے چہرے کو دیکھنے کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ کوئی سائلہ کسی دفتر میں آ کر کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے تو یقیناً آپ اسے دیکھ کر ہی بات کریں گے لہٰذا اگر وہ چہرہ کے پردہ کے بغیر ہے تو ہوس کی نگاہ کے بغیر آپ اس کو دیکھ کر اس سے بات کر سکتے ہیں۔جبکہ شہوت کے ساتھ تو عورت کیلئے بھی مرد کے چہرے کو دیکھنا جائز نہیں ہے اور عورت کے چہرے کے باپردہ ہونے میں سب بڑی حکمت ہی یہی ہے کہ دیکھنے والا بے احتیاطی یا شہوت کے غلبے سے محفوظ رہا جا سکے۔امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ایک حدیث پاک نقل کی ہے کہ جو شخص خوفِ خدا کی وجہ سے غیر محرم کی طرف نگاہ اٹھانی ترک کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عبادت میں ایک خاص لذت پیدا فرما دیتا ہے۔

ھذا ما عندی و اللہ و رسولہٗ اعلم بالصواب

مصادر و مراجع

۱۔ سورہ نور۔آیت نمبر 32

۲۔ سورہ احزاب

۳۔ ضیاءالقرآن جلد سوئم

۴۔ تفسیر کبیر

۵۔ احکام القرآن

۶۔ بحر محیط

۷۔ تفسیر ضیاء القرآن جلد سوم صفحہ 314 تا 317

۸۔ ڈاکٹر محمد فاروق خان ''مرد عورت صفحہ 43۔ادارہ تعلیم و تحقیق اسلام آباد

۹۔ قرآن مجید پارہ 18 سورہ نور آیت 31

۱۰۔ یہ تمام اقوال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تفسیر ابن جریر اور احکام القرآن للجصاص کے حوالے سے اپنی کتاب ''پردہ'' میں نقل کیے ہیں

۱۱۔ تفسیر طبری جلد 18 از علامہ ابن جریر طبری رحمتہ اللہ علیہ

۱۲۔ تفسیر احکام القرآن جلد سوئم صفحہ 315 از علامہ ابو بکر جصاص رحمتہ اللہ علیہ

۱۳۔ تفسیر کبیر جلد سوئم ص 203 از علامہ فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ

۱۴۔ تفسیر بغوی جلد ششم ص 69 از علامہ بغوی رحمتہ اللہ علیہ

۱۵۔ خزائن العرفان ص 511 از صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمتہ اللہ علیہ

۱۶۔ حاشیہ نور العرفان علی ترجمۃ لکنز الایمان ص 563 از علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمتہ اللہ علیہ۔ یہ اقوال مفتی غلام سرور قادری نے اپنی کتاب پردہ میں

نقل کیئے ہیں۔

۱۷۔ القول الصواب فی مسئلۃ الحجاب ص 18 از علامہ ابو البرکات رحمتہ اللہ علیہ

۱۸۔ قرآن مجید سورہ احزاب آیت کریمہ نمبر 59

۱۹۔ ''پردہ'' ص 316 از ابو الاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور

۲۰۔ تفسیر ضیاء القرآن جلد سوئم ص 95 از جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمتہ اللہ علیہ

۲۱۔ تفسیر غرائب القرآن بر حاشیہ ابن جریر جلد نمبر 22 ص 32 از علامہ نیشا پوری رحمتہ اللہ علیہ

۲۲۔ تفسیر بیضاوی جلد چہارم ص 168 از علامہ قاضی بیضاوی رحمتہ اللہ علیہ

متعہ کی شرعی وقانونی حیثیت

متعہ کیا ہے؟

متعہ، نکاح نہیں بلکہ مماثل نکاح (Quasi Marriage) ایک معاہدہ ہوتا ہے جو ایک مرد عورت سے جنسی استفادے کیلئے بالعوض (For Considration) مدت معینہ کیلئے (For Spesific Period) کیا جاتا ہے۔

شدید قلبی ہچکچاہٹ کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں تاکہ ایک طرف شبنم سے پاکیزہ اور چشمے کے پانی سے زیادہ صاف تعلیمات اسلام کے دامن کو اس قبیح اور بے ہودہ قسم کی رسم سے آلودہ کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس کا ازالہ ہو سکے اور دوسری طرف ان لوگوں کی خرافات کا مدلل جواب دیا جا سکے جو متعہ جیسے نجس عمل کا ثواب بیان کرتے نہیں تھکتے۔

متعہ کا پس منظر

اسلام کے آفتاب کے طلوع ہونے سے قبل عرب معاشرے میں کون سی برائی ہے جو رائج نہیں تھی۔ شراب نوشی، قتل و غارت گری، زندہ بچیوں کو درگور کر دینا اور یہاں تک کہ منڈیوں میں اپنی بہو، بیٹیوں کو نیلام کر دینا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے انسان نما حیوانوں کے اس معاشرے میں اصلاح کا عمل شروع فرمایا تو اسلام کے فطرتی اصول تدریجی عمل (Gradual Process) کو لازمی پیش نظر رکھا۔ حتیٰ کہ مکی اور مدنی زندگی میں جو وحی آپ پر اتری وہ بھی فطرت انسانی کے عین مطابق تھی۔ شراب کو ہی لیجئے چھ سال کے دورانیے میں اس کی حرمت کا حتمی حکم نازل ہوا۔ 2 ہجری میں حکم نازل ہوا کہ شراب میں نفع بھی ہے اور نقصان

بھی۔ پھر دو سال کے عرصہ کے بعد 4 ہجری کو دوسرا حکم نازل ہوا کہ شراب پی کر نماز کے قریب نہ جاؤ پھر دو سال کے وقفے کے بعد 6 ہجری کو آخری حکم نازل ہوا کہ شراب حرام ہے۔ اس تدریجی عمل کا اثر یہ ہوا کہ آخری حکم آنے تک صحابہ تربیت کے اس معیار پر پہنچ چکے تھے کہ جونہی شراب کی حرمت کا حکم آیا انہوں نے منہ سے لگی ہوئی صراحیاں زمین پر پٹخ دیں اور ہمیشہ کیلئے تائب ہو گئے۔

اسی طرح متعہ کی بھی ابتدائے اسلام میں انتہائی مجبوری کے عالم میں اجازت تھی اور مجبوری کی صورت یہ تھی کہ وہ مسلمان جو عرصہ دراز تک اپنے اہل خانہ سے دور میدان جنگ میں تھے اور اپنی بیویوں سے جدا تھے۔ لہٰذا انہیں اس کی اجازت دی گئی۔

اور ایک روایت ابن عباس سے ترمذی نے بیان کی ہے کہ متعہ کا رواج ابتدائے اسلام میں تھا۔ جب کوئی شخص باہر سے شہر میں آتا اور اس کو اس شہر سے واقفیت نہ ہوتی تو وہ ایک مخصوص مدت کیلئے کسی عورت سے شادی کر لیتا تا کہ وہ عورت اس کے مال کی حفاظت کرے۔ اس کی چیزوں کو درست رکھے اور دیگر امور میں اس کی معاونت کرے۔ یہاں تک کہ آیت کریمہ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ نازل ہوئی۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اب ان دو (حقیقی بیوی اور کنیز) کے سوا ہر فرج حرام ہے۔

اسلام سے قبل صابیوں اور زرتشتیوں میں یہ رواج موجود تھا لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بہت جلد اس کی حرمت کا اعلان فرما دیا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اہل تشیع کا موقف

شیعوں میں اثنا عشری شیعہ متعہ کو جائز بلکہ بہت زیادہ باعث اجر و ثواب سمجھتے ہیں۔ ان کے بعض فرقے مثلاً اسماعیلیہ اور زیدیہ ایسے جنسی تعلق کو ناجائز تصور کرتے ہیں۔ اثنا عشری شیعوں کے نزدیک ایک شیعہ مرد ایک وقت میں جتنی عورتوں

سے چاہے متعہ کرسکتا ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا شیعہ یا کتابیہ (یعنی مسلمان، عیسائی یا یہودی) ہونا ضروری ہے۔ دوسرے مذاہب مثلاً ہندو، سکھ اور مجوسی عورت سے متعہ نہیں کیا جاتا لیکن ان کے نزدیک ایک شیعہ عورت صرف شیعہ مرد کے ساتھ ہی متعہ کرسکتی ہے۔ متعہ کا معاہدہ لفظ نکاح سے نہیں بلکہ لفظ تمتع سے منعقد ہوتا ہے۔ متعہ کیلئے کچھ معاوضہ اور مدت مقررہ دو لازمی شرائط سمجھی جاتی ہیں۔ اہل تشیع دلیل یہ دیتے ہیں کہ متعہ کا جواز اجماع سے ثابت ہے اور جو چیز اجماع سے ثابت ہو وہ قطعی ہوتی ہے اور اجماع کو منسوخ کرنے کیلئے دلیل قطعی کی ضرورت ہے اور اجماع، خبر واحد سے جو ظنی ہے منسوخ نہیں ہوسکتا۔

اہلسنّت کا مؤقف

اہل سنت والجماعت کے چاروں مکاتب فکر (Four Schools of Thought) کے نزدیک بالاتفاق متعہ حرام ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والا زانی ہے۔

عصرِ حاضر کے عظیم مفسر اور سیرت نگار ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

''شیعہ کا یہ دعویٰ حقیقت کے خلاف ہے کہ اجماع جو قطعی ہے، خبر واحد سے اس کی تنسیخ کی جا رہی ہے حالانکہ یہ ظنی ہے۔ یہ بات درست نہیں کیونکہ جس حدیث میں متعہ کا اعلان ہے وہ خبر واحد اور ظنی نہیں بلکہ پندرہ سو مجاہدین کے سامنے رحمت عالم ﷺ نے اس کی حرمت کا اعلان فرمایا۔ جس ارشادِ نبوی کو ڈیڑھ ہزار مجاہدین اپنے کانوں سے سنیں اور دوسروں کو سنائیں، ایسی خبر کو خبر واحد کیونکر کہا جاسکتا ہے۔'' [1]

اس سے ثابت ہوا کہ متعہ کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہے اور اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع تھا۔

قرآن مجید سے حرمت متعہ کا ثبوت

سنی علماء متعہ کی حرمت کے ثبوت میں قرآن مجید کی حسب ذیل آیات کریمہ پیش کرتے ہیں۔

1- وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ۲

ترجمہ: اور جو اپنی نگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور کنیزوں کے جو ان کے ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بے شک انہیں ملامت نہیں کی جائے گی اور جس نے خواہش کی اس کے سوا تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں جن عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے ان کی صرف دو قسمیں ہیں ایک زوجہ اور دوسری کنیز جو اس مرد کی ملکیت ہو ان کے سوا باقی تمام عورتوں سے جنسی تعلقات کو ناجائز قرار دیا گیا۔

اب ممتوعہ عورت نہ زوجہ ہے اور نہ کنیز کیونکہ شریعت میں جو حقوق اور فرائض زوجہ کے بیان ہوئے ہیں ان کا اطلاق و انطباق ممتوعہ عورت پر نہیں ہوتا۔ ممتوعہ عورت کیلئے نہ نفقہ، نہ طلاق، نہ ایلاء، نہ ظہار، نہ لعان اور نہ ہی وراثت کے احکام ہیں بلکہ وہ چار بیویوں کے حکم میں بھی شامل نہیں اور نہ ہی اس کے کنیز ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ اسے فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے شخص کو ہبہ کیا جا سکتا ہے لہٰذا ممتوعہ اسلام کے عائلی نظام میں کسی جگہ بھی (Adjust) نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ وہ قرآن کی بیان کردہ دونوں قسموں سے خارج ہے لہٰذا ایسی عورت کا مطالبہ کرنے والا آیت قرآن کے مطابق حد سے تجاوز کرنے والا، سرکش اور باغی ہے۔

2- قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر بھی بڑے واضح انداز میں اعلانیہ اور

پوشیدہ یارانے لگانے والیوں کی مذمت ان الفاظ میں فرمائی۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ؎۳

ترجمہ: پس نکاح کرلو ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اور ان کا مہر (Dower) دستور کے مطابق دو تاکہ نکاح سے وہ پاکدامن بن جائیں نہ اعلانیہ زنا کار ہوں اور نہ پوشیدہ یارانے بنانے والی ہوں۔

مذکورہ بالا دونوں آیات کریمہ سے واضح ہو گیا کہ ممتوعہ عورت نہ زوجہ ہے اور نہ کنیز ہے بلکہ متعہ کرنا اور کرانا ایک فحش اور بے ہودہ عمل (Clear fornication) ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کا اس سے بچنا لازمی ہے۔

احادیث میں متعہ کی حرمت کا بیان

قرآن مجید کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے اپنی احادیث میں بڑے واضح اور واشگاف الفاظ میں متعہ کی حرمت کو بیان فرمایا ہے۔ احادیث ملاحظہ ہوں۔

1- امام مسلم نے ربیع بن معبد جہنی سے روایت کیا ہے کہ ان کے باپ نے ان سے یہ حدیث بیان کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے استمتاع (وقتی استفادہ) کی اجازت دی تھی اب اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک کیلئے حرام کر دیا ہے۔ پس جس شخص کی ایسی عورت ہو اس کو چھوڑ دے اور جو کچھ اس کو دیا ہے اس سے واپس نہ لے۔ ؎۴

2- امام مسلم نے اس روایت کو دوسرے طرق سے بھی بیان کیا ہے۔ خازن نے اپنی سند سے حضرت جابر سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک میں خطبہ پڑھا اور اللہ تعالیٰ کی ثنا بیان فرمائی اور

متعہ سے منع فرمایا۔

3- امام مسلم نے ایک اور روایت بیان کی کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال متعہ کی اجازت دی جب ہم مکہ میں داخل ہوئے اور مکہ مکرمہ سے نہیں نکلے تھے کہ متعہ سے منع فرمادیا۔

4- ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے متعہ کی تین بار اجازت دی پھر اس کو حرام کر دیا۔ اگر کوئی متعہ کرے گا اور وہ محصن (شادی شدہ) ہوگا تو میں اس کو ضرور رجم کروں گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متعہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ متعہ حرام ہے۔ [5]

5- حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمتہ اللہ علیہ نے ضیاء النبی جلد چہارم میں ابو جعفر محمد بن الحسن الموسیٰ کی کتاب تہذیب الاحکام کے حوالے سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت بیان کی ہے جس کو پڑھ کر حقیقت حال مزید روزِ روشن کی طرح آشکارہ ہو جاتی ہے۔

عن زید بن علی عن ابیه عن علی علیهم السلام قال حرم رسول الله ﷺ یوم خیبر لحوم الحمر الاهلیلة ونکاح المتعة۔ [6]

ترجمہ: حضرت زید بن علی نے اپنے والد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ خیبر کے روز پالتو گدھوں کے گوشت اور متعہ کے نکاح کو حرام قرار دینے کا اعلان فرمایا تھا۔

6- بسام صیرفی نے حضرت ابو عبد اللہ جعفر الصادق سے متعہ کے بارے میں

سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا "فقال رضی اللّٰہ عنہ انھا الزنا" فرمایا یہ کھلا زنا ہے

مذکورہ بالا احادیث کے مطالعہ سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے واضح الفاظ میں متعہ کی حرمت کا اعلان فرمایا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ وقت کی حیثیت سے حرمت متعہ کو قانوناً نافذ فرمایا اور تمام صحابہ کرام نے بالاجماع اس کی حرمت کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص متعہ کی حرمت کا قائل نہیں یا اس کے جواز میں روایات گھڑنے سے باز نہیں آتا تو ایسا نابکار نہ صرف یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات اور ارشادات کا منکر ہے بلکہ اسلام جیسے مقدس اور مطہر دین کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا۔ **اذا فاتک الحیاء فافعل ماشئت**

متعہ کے قانونی اثرات

(Legal effects of muta marriage)

شیعہ فقہ کے نزدیک متعہ کے درج ذیل قانونی اثرات ہیں۔

1- معاہدہ متعہ سے وراثت کے حقوق پیدا نہیں ہوتے لیکن متعہ کے زمانہ کی اولاد قانونی طور پر صحیح النسب قرار پاتی ہے اور ماں باپ دونوں کی طرف سے وراثت کی حقدار ٹھہرتی ہے۔

2- متعہ میں حق طلاق (Right of Divorce) تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ مدت گزر جانے کے بعد یہ معاہدہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے لیکن مرد مدت سے قبل بھی یہ معاہدہ ختم کر سکتا ہے۔

3- اگر متعہ میں عورت سے مجامعت (Sexual intercouse) نہ کی ہو تو قانونی طور پر وہ نصف مہر کی مستحق ہوتی ہے۔

4- مدت متعہ کے بعد ممتوعہ کی عدت دو حیض یا زیادہ سے زیادہ پینتالیس دن

ہوتی ہے۔

5- متعہ میں عورت قانونی طور پر نان ونفقہ (maintenence) کی حقدار نہیں ہوتی کیونکہ حقیقی معنی میں وہ زوجہ نہیں ہوتی۔

مغربی تہذیب سے مرعوب طبقہ سے ایک سوال

شیعہ کے مطابق بھی متعہ کرنے والے مرد وعورت کے درمیان رشتہ ازدواج نہیں ہوتا بلکہ مخصوص مدت کیلئے ایک عارضی معاہدہ ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ممتوعہ عورت کی معاشرتی حیثیت کیا ہے۔ عرب معاشروں میں وقتی طور پر جنسی تعلق قائم کرنے والی عورت کو خلیلہ کہا جاتا ہے جس کی جمع خلائل ہے۔ یا خدن کہا جاتا ہے جس کی جمع اخدان ہے اور دونوں کا معنی بدکار عورتیں ہیں۔ مغربی معاشروں میں ایسی عورت کو گرل فرینڈ کہا جاتا ہے جو رات کے کسی بھی وقت اپنے باپ، بھائی اور خاوند کی اجازت کے بغیر کسی بھی اجنبی کے ساتھ شب باشی کیلئے بلا روک ٹوک چلی جاتی ہے اور مغربی معاشروں میں اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اب یہ ان کے کلچر کا حصہ بن چکا ہے۔

ایک اسلامی معاشرے اور غیر اسلامی معاشرے میں بنیادی فرق ہی یہی ہے کہ اسلامی معاشرہ عورت کو تقدس، عزت اور احترام عطا کرتا ہے جبکہ غیر اسلامی معاشرے میں عورت مرد کے ہاتھوں کھلونا (She had become a play thing in the hands of men) سمجھی جاتی ہے۔ جو وہ جب چاہے استعمال کرنے کے بعد پھینک سکتا ہے۔ اسلام عورت کو اس طرح داشتہ بنا کر رکھنے کی شدید مذمت کرتا ہے۔ لہٰذا میرا یہ سوال مغرب سے مرعوب اور جدید تعلیم یافتہ ان عورتوں سے ہے جو مغربی آزادی کی دلدادہ ہیں اور تعلیمات اسلام کو اپنے لیے بندھن سمجھتی ہیں اور آئے روز پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے کتبے اٹھا کر حدود آرڈیننس کے خاتمے کا مطالبہ کرتی ہیں کہ کیا اسلام نے متعہ یا نکاح مؤقت (Temparary Marriage)

کو حرام قرار دے کر عورت کی عزت کو چار چاند نہیں لگا دیئے؟ اب ان عورتوں کو مظاہرے تو متعہ یا نکاح مؤقت کے خلاف کرنے چاہئیں جو عورت کے تقدس کو پامال کر کے ان کی عزت و غیرت کی نیلامی کا باعث بنتے ہیں نہ کہ احکامِ اسلام اور حدود آرڈیننس کے خلاف جس نے عورت کو ہر صاحب ہوس کے آتشکدہ کی زینت بننے سے بچالیا ہے اور صرف ایک مرد کے ساتھ اسے جائز شادی کے بندھن میں باندھ کر اس کی معاشرتی حیثیت کا تعین کر دیا ہے کہ اگر عہد جدید کی عورت اسلام کی حدود میں رہ کر زندگی بسر کرے تو حورانِ جنت بھی اس کی پاکدامنی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

مصادر و مراجع

۱۔ ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جلد چہارم کے صفحہ نمبر 269 تا 270

۲۔ المومنون: آیت ۵ تا ۷ پ ۱۸

۳۔ النساء۔ آیت ۲۵

۴۔ مسلم شریف

۵۔ مجموعہ قوانین اسلام جلد اوّل صفحہ 208 تا 211

۶۔ ضیاء النبی جلد چہارم

سیرت طیبہ کی روشنی میں

عورت کا مقام اور دائرہ کار

اسلام وہ واحد دین ہے جو صرف مذہبی معاملات میں ہی رہنمائی فراہم نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں کامل ہدایات سے نوازتا ہے۔ اسلام جس ضابطہ حیات کا درس دیتا ہے۔ اس کی رو سے ہر مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت چند مخصوص ذمہ داریوں اور فرائض کو ادا کرنے کا پابند ہے اور چند حقوق و مراعات کو حاصل کرنے کا مستحق ہے۔

ویسے تو ہر معاشرے میں عورت کے مقام کا دائرہ کار صدیوں سے موضوع گفتگو ہے لیکن ماضی قریب میں ان موضوعات نے خاصی سنجیدہ صورت اختیار کر لی ہے اور بعض مسائل کے حوالے سے تو صورت حال خاصی پیچیدہ ہو چکی ہے۔

عورت کی سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں شرکت ایسے موضوعات ہیں جن پر میڈیا میں بھی بالعموم بحث جاری رہتی ہے۔ قبل اس کے کہ سیرت طیبہ کی روشنی میں مسلمان عورت کے مقام و مرتبہ سے آگاہی حاصل کی جائے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ دیگر مذاہب اور ثقافتوں میں عورت کا مقام و مرتبہ کیا تھا اور اسلام نے عورت کو کن خوبیوں اور کمالات سے نوازا ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کا تقابل نہ کیا جائے دوسری چیز کا حسن نکھر کر سامنے نہیں آ سکتا۔

یہ فقط دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اسلام جدید معاشرے کی عورت کو بھی وہی حقوق عزت و وقار، عزت نفس اور پاکی و طہارت عطا

فرماتا ہے جو اس نے زمانہ قدیم کی عورت کو عطا کر کے اسے زمین کی پستیوں سے اٹھا کر اوج ثریا تک پہنچا دیا تھا۔

یہودیت اور عورت

یہودی مذہب کے پیروکاروں نے بھی الہامی ہدایات کا چہرہ مسخ کر کے عورت کے بارے میں ایسے رجحان کو پروان چڑھایا جو کسی طور پر بھی عدل و انصاف کے تقاضوں سے مناسبت نہیں رکھتا، یہودی مذہب کے مطابق مرد نیکی کا پتلا ہے جبکہ عورت برائی کا مجسمہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام بذات خود جنت کی نعمتوں میں تھے مگر حوا نے انہیں خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کیا۔ عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے خدا نے آدم علیہ السلام سے ممنوعہ پھل کھانے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جس عورت کو تو نے میرا ساتھی بنایا ہے اس نے مجھے دیا اور میں نے کھایا چنانچہ اس سزا میں خدا نے عورت کو حمل اور ولادت کی تکلیف میں ڈالا۔ [1]

یہودی قانون میں مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم رہتی ہے اور اسے دوسری شادی کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ عہد نامہ قدیم کی عبارت کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے ''جو کوئی خدا کا پیارا ہے جو اپنے آپ کو عورت سے بچائے گا ہزار آدمیوں میں ایک خدا کا پیار پائے گا لیکن تمام عالم کی عورتوں میں ایک عورت بھی ایسی نہیں پائی جاتی جو خدا کی پیاری ہو''۔ [2]

عیسائیت اور عورت

مسیحیت نے بھی عورت کو اپنے معاشرے سے خارج کر دیا تھا اور عورت سے نفرت کا بیج بو کر اپنے معاشرے کی تشکیل کا پروگرام مرتب کیا۔ کلیسا کی یہی زیادتیاں تھیں جن کی وجہ سے بڑے بڑے پادریوں نے عمر بھر اپنی ماؤں کی شکل نہیں دیکھی کیونکہ وہ عورت کو برائی کا پیکر اور گناہ کی مشین سمجھتے تھے۔

سینٹ پال نے تھمیس کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ

"عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سیکھنی چاہیے۔ میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے یا وہ مرد پر حکم چلائے کیونکہ پہلے آدم بنایا گیا پھر حوا بنائی گئی اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ حوا فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی۔ [3]

عیسائیت کے ابتدائی دور کی ایک بہت بڑی مذہبی شخصیت ترتولیون (Tritulion) عورت کے متعلق یہ نظریہ ظاہر کرتے ہیں کہ

"وہ شیطان کا دروازہ، وہ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی خدا کے قانون کو توڑنے والی اور خدا کے خلاف ورغلانے والی تحریش اور مرد کو غارت کرنے والی ہے۔"

مسیحی فضلاء میں سے سینٹ پال، سینٹ آگسٹائن اور دیگر مشائخ کلیسا کے خیالات میں بھی عورت شیطان کا آلہ کار مجسمہ بدی اور خواہشات نفسانی کا مبداء ہے۔ بائبل میں آدم وحوا کے قصے کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ حوا کو شیطان نے بہکایا اور پھر اس نے آدم کو۔ [4]

بدھ مت اور عورت

بدھ مذہب کے تاریخی مطالعہ سے عورت کو کوئی باعزت مقام حاصل ہونے کا ثبوت نہیں ملتا اس کے برعکس عورت سے نفرت اور اس کی تذلیل وتحقیر کے ثبوت ملتے ہیں۔ بدھ مت میں عورت کے متعلق نظریات کا ایک نمونہ "انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس (Encyclopedia of Religion and Ethics) کے مقالہ نگار نے ایک بدھ مفکر چھلا واگا (chulla vagga) کے قول سے پیش کیا ہے جس کو اولڈ برگ نے اپنی کتاب بدھا (Buddha) (مطبوعہ 1904ء صفحہ 149) میں نقل کیا ہے کہ

"پانی کے اندر مچھلی کی ناقابل فہم عادتوں کی طرح عورت کی فطرت بھی ہے اس

کے پاس چوروں کی طرح متعدد حربے ہیں اور سچ کا اس کے پاس گزر نہیں ہے۔ ۵
انہی خیالات کا عکس گوتم بدھ کی تعلیمات و تلقینات میں بھی ملتا ہے کہ گوتم بدھ نے اپنے معتقدین کو حکم دیا کہ ''اگر تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنی عورتوں سے تعلقات منقطع کر لینے چاہئیں۔ چنانچہ موصوف خود بھی اس پر عمل پیرا ہوئے اور انہوں نے اپنی چہیتی بیٹی کو چھوڑ کر پہاڑوں میں سکونت اختیار کی تھی۔

ہندو مذہب اور عورت

نامور محقق عباس محمود عقاد ہندو معاشرے میں عورت کے مقام پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں'' ہندوستان میں منو (جو ہندوستان کے معاشرتی و عائلی قوانین کا ماخذ سمجھا جاتا ہے اسے ''منوسمرتی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''منوسمرتی'' ہندوستان کی سب سے قدیم قانون کی کتاب سمجھی جاتی ہے اکثر محققین کا خیال ہے کہ اس کتاب کا زمانہ تالیف تیسری صدی عیسوی ہے) اس قانون کے مطابق باپ، شوہر، یا دونوں کی صورت میں بیٹے سے علیحدہ عورت کا کوئی مستقل حق نہیں، چنانچہ عورت صغر سنی میں باپ کی مطیع ہوتی ہے جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی اگر وہ نہ ہوں تو اپنے اقرباء کی معاشی معاملات میں اس کی حق تلفی سے زیادہ سخت امر یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے ساتھ ہی اس کا بھی مر جانا اور چتا پر ''ستی'' ہو جانا ضروری تھا۔ یہ قدیم رسم برہمنی تمدن کے دور سے سترہویں صدی عیسوی تک برقرار رہی اور اس کے بعد مذہبی حلقوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے حکومت ہند کے سرکاری حکم کے تحت ممنوعہ قرار دیا گیا، ہندوؤں کے قانون کے مطابق تو تقدیر، طوفان، موت، زہر اور زہریلے سانپ بھی اتنے خراب نہیں جتنی عورت بری ہے۔

چانکیہ برہمن جس نے ہندوؤں کی مقنن منو مہاراج کی ''منوسمرتی'' کو حشو و زوائد سے پاک کیا عورت کے متعلق لکھتا ہے'' جھوٹ بولنا، بغیر سوچے سمجھے کام

کرنا، فریب، منافقت، طمع، نا چاقی اور بے رحمی یہ عورت کے کرداری عیوب ہیں۔
امریکہ سے ایک پاکستانی خاتون صحافی طیبہ ضیاء لکھتی ہیں "زمانہ قدیم میں ہندوستان میں مادرانہ نظام قائم تھا شوہر بیاہ کر بیوی کے گھر جاتا اس میں طلاق بہت آسان ہوتی تھی ایک وقت آیا جب مادرانہ نظام دم توڑ گیا اور عورت عمر بھر کیلئے خود کو شوہر کے لیے وقف کر دیتی اس طرح عورت کا سماجی رتبہ بالکل ختم ہو گیا جو عورت شوہر کی چتا پر جل جاتی وہ پاکباز سمجھی جاتی تھی۔ ہندو تاریخ کی کتب میں ستی کی پہلی رسم 510ء میں ملتی ہے۔ ہندو معاشرہ میں عورت کی آزادی انگریز کے زمانہ میں ہوئی اور ستی کی رسم پر پابندی لگائی گئی۔ ۶

عورت اور عہد جاہلیت

اسلام سے قبل عرب کے معاشرے میں عورت کا مقام بڑا ہی بدتر تھا، عہد جاہلیت میں عورت کو صرف مرد کے نفسانی جذبات اور خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور لڑکی کی پیدائش کو ذلت و عار کا باعث سمجھا جاتا تھا، قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

"جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تو اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو جاتا اور وہ اسے بڑی بری خبر خیال کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسروں کے سامنے آنے سے شرم کرتا ہے اور سوچتا ہے کیا میں اسے ذلت کیلئے زندہ رہنے دوں یا زمین میں گاڑ دوں۔ یاد رکھو! وہ جو بھی فیصلہ کرتے ہیں بہت برا ہے۔ ۷

مشہور ہندو سیرت نگار سوامی لکشمی پرشاد "معصوم بچیاں تکبر کی قربان گاہ پر" کے زیر عنوان لکھتے ہیں "عربوں کو اپنی شجاعت و بہادری پر بڑا ناز تھا ان کی طبیعت بڑی غیور تھی وہ کسی دوسرے انسان کے آگے واجب طور پر جھکنے کے خیال کو بھی سراپا استحقار سے ٹھکراتے تھے۔ یہ غلط وقار ان کے صفحہ دماغ پر ایک نقش حقیقت بن کر ثبت

ہو گیا تھا جس کے آ۔گے انہوں نے اس عورت کی حفاظت کو بھی جس کے گلشن شباب کو وہ اپنی ہوس کارانہ دست برد کیلئے سامان نشاط سمجھتے تھے پس پشت ڈال دیا تھا، بساط ہستی کی نو وارد جیتی جاگتی بچیوں کا گلہ گھونٹ دینا ان کی اس جہالت کا جو شجاعت کے غلط استعمال نے ان کے قلب پر مستولی کردی تھی ایک ادنیٰ کرشمہ تھا، پانچ پانچ، سات سات سال کی نوعمر پھول جیسی بچیوں کو کھلا پلا کر اور خوبصورت کپڑوں میں باہر لے جا کر کسی گڑھے میں دھکیل کر پیوند زمین کر دینا ان کے ظلم وستم کا دنی کرشمہ تھا۔ ۸

معروف فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤنی بان اپنی تصنیف میں لکھتا ہے کہ

''عورتوں پر اور ان کی حالت پر اسلام کے اثر کے دریافت کرنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں قبل از اسلام ان کی حالت کیا تھی'' جو برتاؤ عورتوں کے ساتھ قبل از اسلام ہوتا تھا اس کا پتہ ہمیں قرآن کے بعض احکام ونواہی سے بھی ملتا ہے۔ ۹

حافظ ابن عساکر ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں عربوں کی دختر کشی کی رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے بیٹی کو زندہ درگور کیا وہ قیس بن عاصم تھا۔ ۱۰

قیس بن عاصم جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے نے ایک موقع پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ میں نے عہد جاہلیت میں بارہ یا تیرہ بیٹیوں کو زندہ درگور کیا تھا۔ ۱۱

اسی طرح امام ابوعبداللہ دارمی المتوفی 255ء نے عہد جاہلیت میں عربوں کے لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے کہ جب عرب قبائل اسلام قبول کر لیتے تو بعد ازاں وہ بڑے دردناک انداز میں اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبل از اسلام کے واقعات بتاتے جن میں ان کی اپنی بچیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کی منظر کشی ہوتی جسے سن کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت پریشان ہو جاتے۔ ۱۲

اسلام اور عورت

اسلام نے عورت کو سماجی اور تمدنی حوالے سے ان رفعتوں اور عظمتوں سے نوازا ہے جس کا اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ آفتاب اسلام کی ضیاء بار کرنوں نے عورت کے حوالے سے انسانیت کے تصورات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مسلمان مورخین اور اہل علم نے اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ پر تو بڑا وسیع کام کیا ہے تاہم ذیل میں چند غیر مسلم اصحاب دانش کے حوالہ جات نقل کر رہا ہوں جنہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے وقار نسواں میں اس قدر اضافہ فرمایا کہ حوران جنت بھی مسلمان عورت کے مقام پر رشک کرنے لگیں۔ چنانچہ ای ڈرمنگھم لکھتا ہے۔

''اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے عربوں کی زندگی بدل دی تھی اس سے پہلے طبقہ نسواں کو کبھی وہ احترام حاصل نہ ہو سکا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے انہیں حاصل ہوا۔ جسم فروشی، عارضی شادیاں اور آزادانہ محبت ممنوع قرار دے دی گئیں۔ لونڈیاں اور کنیزیں جنہیں اس سے قبل محض اپنے آقاؤں کی دل بستگی کا سامان سمجھا جاتا تھا وہ حقوق و مراعات سے نوازدی گئیں۔

اسی طرح ای بلائیڈن کا بیان ہے۔

''سچا اور اصل اسلام جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیکر آئے اس نے طبقہ نسواں کو وہ حقوق عطا کئے جو اس سے پہلے اس طبقہ کو تاریخ انسانی میں نصیب نہیں ہوئے تھے۔ [14]

اسلام نے عورتوں کو جن حقوق اور مراعات سے نوازا ہے۔ ذیل میں ان حقوق کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔

عورت کے معاشی حقوق اور معاشی پیش رفت میں عورتوں کا کردار

اسلام نے عورتوں کو ایسے معاشی حقوق سے نوازا ہے جن کی بدولت ایک مسلمان عورت عزت نفس کے ساتھ اپنی زندگی کے شب و روز بسر کر سکتی ہے۔ اسلام

نے بنیادی طور پر معاشی ذمہ داریاں مرد کو سونپی ہیں۔ ایک مرد اپنے خاندان کی معاشی ضروریات کا کفیل اور ذمہ دار ہے۔ اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل عورت کو ان معاشی حقوق سے نوازا ہے جن کے بارے میں آج مغرب میں تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔ مثلاً اسلام میں ایک عاقل و بالغ لڑکی جائیداد کی مالک بن سکتی ہے اور اس کی خرید و فروخت کر سکتی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا نہ ہو وہ اپنے مال کے بارے میں مرد کی طرح آزادانہ فیصلے کرنے کی مجاز ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ بیوی چاہے کتنی ہی مالدار کیوں نہ ہو جائے روٹی کپڑا اور مکان کی ذمہ داری شوہر کے کندھوں پر ہے اس طرح طلاق یا علیحدگی کی صورت میں عدت کے دوران بیوی کے نفقے کا ذمہ دار بھی مرد ہے اور بچوں کے اخراجات برداشت کرنا بھی مرد کی ذمہ داری ہے۔ اسلام میں حق مہر کی مستحق بھی عورت کو قرار دیا گیا ہے اس سلسلہ میں حق مہر کی زیادہ سے زیادہ رقم مقرر نہ کر کے عورت کے معاشی حقوق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو دیگر ثقافتوں کے برعکس اسلام میں عورت کو زیادہ معاشی تحفظ فراہم کیا گیا ہے کیونکہ فکر معاش کی بنیادی ذمہ داری سے عورت کو مستثنیٰ رکھ کر مرد کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ عورت کی ضروریات کو پورا کرے لیکن اگر عورت یہ سمجھے کہ اسے خود اپنے قدموں پر کھڑے ہونا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے کیونکہ جہاں تک عورتوں کی معاشی پیش رفت کا تعلق ہے تو اسلام میں کہیں بھی عورت کو معاشی تگ و دو سے منع نہیں کیا گیا تاہم اس کی معاشی سرگرمیوں کی چند حدود کا تعین کر دیا ہے تاکہ کوئی اس کے تقدس و طہارت پر حرف گیری نہ کر سکے۔ ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں عورت طب یا میڈیکل سائنس کا شعبہ اختیار کر سکتی ہے جس کا ثبوت ہمیں عہد نبوی کی چند مسلم خواتین کے کردار سے بھی ملتا ہے کہ بعض خواتین جنگوں میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور ان کی نگہداشت کا فریضہ بھی سرانجام دیتی تھیں۔ چنانچہ عصر حاضر

میں خواتین کے علاج معالجے کیلئے نرسوں کی اور لیڈی ڈاکٹرز کی ضرورت ہے اس طرح خواتین تعلیم کے شعبے سے بھی وابستہ ہوسکتی ہیں۔ ٹیچرز، لیکچرار اور پروفیسرز نونہالان وطن کو علم کے نور سے منور کرسکتی ہیں۔ لیکن عہد حاضر میں حقوق نسواں کی نام نہاد تنظیمیں جس طرح عورت کو ''کمرشل ازم'' کا شکار کر کے اسے جنسی تسکین اور تجارتی اشیاء کی فروخت کا سستا ذریعہ بنا کر پیش کر رہی ہیں۔ اسلام اس کی کسی طور پر بھی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ عورت کی بے لگام معاشی سرگرمیوں کی وجہ سے گھر کا سکون تباہ ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اختلاف رونما ہونے لگتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت نہیں ہوتی۔ مغربی ممالک کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ عورت کی بھرپور معاشی جدوجہد سے گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کی آمدن زیادہ اہم ہے یا خاندان کی تعلیم و تربیت جس کی تمام تر ذمہ داری عورت کے کندھوں پر ہے؟ اسلام نے ذمہ داریوں کی تقسیم کا نظام متعارف کروا کر عورت کے مزاج صحت اور فطرت کے مطابق اسے فرائض سونپے ہیں جبکہ محدود دائروں میں اسے معاشی پیش رفت کی بھی اجازت دی ہے۔ اسلام اختلاط مرد و زن کی اجازت نہیں دیتا لیکن بدقسمتی سے آج کا معاشی نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اختلاط مرد و زن کو سماج کی ضرورت نہیں بلکہ سب سے بڑی خوبی تصور کرتے ہیں جس کے نتیجے میں خاندان کا نظام شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے لہٰذا یہ اسلام ہی ہے جس نے افراط و تفریط سے پاک ایسا خاندانی نظام متعارف کروایا ہے جس میں مسلمان عورت کی معاشی ضروریات کی کفالت کا اہتمام بھی ہے اور اس کی ذات وقار اور نسوانی حیثیت کے تحفظ کی ضمانت بھی ہے۔

خواتین کے مغربی حقوق

اسلام نے اس کائناتی تاریخ میں سب سے پہلے عورتوں کو ان حقوق سے

نوازا ہے جس کے بارے میں صدیوں بعد مغرب کے معاشروں میں احساس وشعور پیدا ہوا مثلاً 1881ء تک برطانیہ میں عورت کو جداگانہ حق جائیداد حاصل نہیں تھا۔ 1881ء میں جا کر برطانیہ جس کی جمہوریت کو جمہوریت کی ماں کہا جاتا ہے نے "The Married Women ACT" پاس کیا جس کی رو سے شادی شدہ خواتین کو حق جائیداد دیا گیا جبکہ اسلام کے معاشرے میں چودہ سو سال قبل قرآن مجید کی زبان میں یہ اعلان کیا جارہا تھا ''لِلذَّکَرِ مثل حظ الانثیین'' کہ جائیداد میں جس طرح مرد کا حق ہے اس طرح عورت کا بھی حق ہے۔ اس طرح مسلمان بچی پیدائش کے وقت سے ہی جائیداد کی حقدار بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے نامور محقق پروفیسر کرشنا راؤ اپنی کتاب ''اسلام کے پیغمبر'' میں لکھتا ہے کہ اسلام کی یہ جمہوری روح جس نے عورتوں کو مردوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ عربوں کی مضبوط روایت یہ تھی کہ وارث صرف وہی ہوسکتا ہے جو برچھے سے کھیل سکے اور تلوار استعمال کر سکے لیکن اسلام کمزور جنس کا دفاع کرتا ہے اور عورت کو ماں باپ کے ورثے سے حصہ دیتا ہے۔ اسلام نے صدیوں قبل عورت کو جائیداد رکھنے کا حق دیا۔ اسلام میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ عورتیں اپنے تسلیم شدہ حقوق سے محروم نہ ہوں۔

اسی طرح امریکہ جو انسانی اور نسوانی حقوق کا نام نہاد ٹھیکیدار ہے 1925ء تک وہاں عورتوں کو حق رائے دہی حاصل نہ تھا۔ عورت نہ تو ووٹ کاسٹ کر سکتی تھی اور نہ ہی پارلیمنٹ کی ممبر بن سکتی تھی۔ لیکن اسلام میں بالغ عورت کو رائے دہی کا حق اور مکمل آزادی دی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس شوریٰ (Consulta Tive Body Or Parliment) میں حق مہر کی زیادہ سے زیادہ رقم کی تخصیص کا ایک بل پیش کیا تو مجمع سے ایک عورت اٹھی اور اس نے دلائل دیتے ہوئے عرض کی اے عمر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عورتوں کے

حق مہر کے حوالے سے ''قنطاراً'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم عورتوں کو بطور مہر ڈھیروں ڈھیر بھی دے چکو تو واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ اے عمر رضی اللہ عنہ آپ اپنی رائے سے قرآن مجید کے مطلق حکم کو مقید نہیں کر سکتے۔

اسلامی معاشرے میں رائے کی آزادی عورتوں کے حقوق اور فریق مخالف کی رائے کے احترام کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھرے مجمع میں فرمایا ''قد اخطاء امراءٌ واصابت اِمرأۃٌ'' تحقیق ایک مرد سے غلطی ہوگئی ہے اور ایک عورت حق پر ہے۔ اس عورت کی وجہ سے آج تک اسلامی تاریخ میں حق مہر کی تخصیص کا بل پاس نہیں ہوسکا بلکہ حق مہر کو مرد کی معاشی حالت کے مطابق مقرر کرنے پر منحصر رکھا گیا ہے ان حقوق کے علاوہ بیسوں ایسے حقوق ہیں جن کے بارے میں مغرب کو ابھی شعور بھی حاصل نہیں ہوا تھا اور اسلامی معاشرے کی خواتین ان حقوق سے مستفیض ہو رہی تھیں۔

مغرب میں ابتداء عورت کو گواہی دینے کے حق سے بھی محروم رکھا گیا۔ یہودی ربی حضرات بیسویں صدی میں غور و فکر کر رہے تھے کہ عورت کو گواہی دینے کا حق ہونا چاہیے یا نہیں جبکہ اسلام ڈیڑھ ہزار سال قبل سے عورت کو گواہی دینے حق عطا فرما چکا ہے۔

مغرب کے معاشروں میں عورت کے کردار پر انگلی اٹھانا قابل سزا جرم نہیں ہے۔ جبکہ اسلام کے معاشرے میں جو لوگ پاکدامن عورتوں پر برائی کی تہمت لگاتے ہیں اور پھر اس کو ثابت نہیں کر سکتے تو ان کیلئے 80 کوڑوں کی سزا مقرر ہے۔

ان دلائل سے صاحب عقل آدمی خود نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ مغرب عورتوں کے حقوق کا زیادہ محافظ ہے یا اسلام؟ اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ہر ذی شعور یہ فیصلہ کرے گا کہ اسلام نے عورتوں کو جن حقوق سے نوازا انکا عشر عشیر بھی مغرب کی عورتیں حاصل نہیں کر سکیں۔

تعلیمی کاوشوں میں عورتوں کے فرائض

اسلام نے مردوں اور عورتوں کو یکساں طور پر حصول علم کی تاکید فرمائی بلکہ دین و دنیا کے بنیادی مسائل کا علم مردوں اور عورتوں کیلئے فرض قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے

''طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة''

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے دور میں خواتین کی تعلیم و تربیت کیلئے چند دن مخصوص تھے جن میں آپ انہیں دین و شریعت کی باتوں سے آگاہی بخشتے تھے اور دورِ صحابہ میں ہمیں متعدد، عالم خواتین کی مثالیں نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنے جاندار علمی کردار سے مسلم معاشروں سے جہالت کے اندھیروں کو دور کیا۔ سب سے اہم مثال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور نبی اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ ہونے کی حیثیت سے ام المومنین ہیں۔ آپ سے خلفائے راشدین اور بیشتر صحابہ کرام نے علمی استفادہ کیا۔ آپ کے ممتاز ترین شاگرد عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے تفسیر قرآن، فرائض، حلال حرام ادب و شعر اور تاریخ و ادب کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا وہ نہ صرف یہ علوم دینیہ کی عالمہ تھیں بلکہ دیگر علوم مثلاً طب پر انہیں ماہرانہ دسترس حاصل تھی۔

نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آنے والے وفود جب آپ ﷺ سے گفتگو کرتے تو آپ اس گفتگو سے حاصل ہونے والی معلومات کو ذہن نشین کر لیتیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو علم ریاضی سے بھی دلچسپی تھی۔ متعدد صحابہ کرام میراث کے مسائل آپ سے پوچھتے اور آپ انہیں ہر وارث کے حصے نکال کر بتاتیں۔ متعدد مسائل میں آپ سے تقریباً 2210 احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری جو خود بہت بڑے عالم تھے فرماتے ہیں۔ جب

صحابہ کرام کو کسی مسئلے کے بارے میں علم نہ ہوتا تو ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے وہ ہماری صحیح راہنمائی فرماتیں۔ آپ سے 88 علماء نے مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کی چنانچہ تاریخ میں آپ کو ''استاذ الاساتذہ'' کا مقام حاصل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ بھی متعدد صحابیات کے علم و فضل کا پتہ چلتا ہے۔

ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو بھی علم فقہ (Islamic Law) میں مہارت حاصل تھی۔ امام نووی رحمتہ اللہ علیہ کے بقول حضرت ام سلمٰی رضی اللہ عنہا کے بارے میں ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ 32 علماء نے آپ سے پردہ کی اوٹ میں تعلیم حاصل کی۔

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن کسی مسئلہ پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آپ سے سارا دن بحث ہوتی رہی لیکن وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غلط ثابت نہ کر سکے۔

حضرت انس کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا بھی بہت بڑی عالمہ تھیں اور اسلامی دعوت میں خصوصی مہارت رکھتی تھیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہا کی پوتی سعیدہ نفیسہ کے بارے میں منقول ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے تعلیم حاصل کی اس طرح ام الدرداء رضی اللہ عنہا جو مشہور صحابی حضرت ابو درداء کی والدہ تھیں انہیں علوم عقلیہ پر کمال حاصل تھا ان کے علم و فضل کی گواہی امام بخاری جیسے محدث و عالم نے بھی دی ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی بودان کی بہن فخر النساء جو بڑی عمر کی عورت تھیں بغداد کی جامع مسجد میں بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کرتی تھیں۔ ادب، بیان، بلاغت اور شاعری میں انہیں ممتاز ترین مقام حاصل تھا۔ وہ کئی جنگوں میں شریک ہوئیں اور مردوں کے شانہ بشانہ لڑیں۔

اسلامی تاریخ میں المستکفی کا نام بڑا مشہور ہے جو اسپین کے امراء میں سے ایک کی صاحبزادی تھیں۔ بادشاہوں کی طرح ان کے علمی وادبی دربار منعقد ہوتے اور بڑے بڑے ادباء ان کی خدمت میں علمی استفادہ کیلئے آتے تھے۔

ان کے علاوہ اندلس، بغداد قاہرہ اور حرمین شریفین سے تعلق رکھنے والی ایسی بیشمار عالمہ عورتوں کے حالات ملتے ہیں جن سے لوگ مسائل پوچھتے اور عربی لغت کی تحقیق کیا کرتے تھے۔

ان دلائل وشواہد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اسلام میں عورتوں کو حصولِ علم کی نہ صرف آزادی ہے بلکہ اسلام تعلیم حاصل کرنے والی عورت کو تحسین اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن ایسی تعلیم یا ایسا نظام ونصاب تعلیم جو عورت کے وقار میں اضافے کی بجائے کمی کا باعث بنے اسلامی طور پر مستحسن نہیں ہے کیونکہ عورت کی تعلیم کا مقصد اس کی حیاء داری اور طہارت وتقدس کا تحفظ ہے جبکہ موجودہ سیکولر نظام تعلیم عورت کو مخلوط تعلیم کے ذریعے شمع محفل بنا کر اسے اس مقام رفیع سے نیچے گرانا چاہتا ہے جس کا اسلام نے اسے امین بنایا ہے۔

قرآن کا نسوانی مطالعہ

اسلامی ماخذ کی تعبیر نو اور بالخصوص ان کی نسوانی تعبیر ایک ایسا موضوع ہے جس پر بعض علمی حلقوں کی طرف سے پرزور وکالت کی جارہی ہے کہ ایک عالمہ خاتون کو بھی قرآنی احکامات کی تشریح وتفسیر کا حق اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح مرد عالم دین کو یہ حق حاصل ہوتا ہے یا کہ نہیں؟ اہل علم کی غالب اکثریت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تفسیر قرآن جیسا سنجیدہ کام عورتوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ وہ جذباتی اور غیر منطقی مزاج رکھتی ہیں۔

اور بعض اہل علم ''جدید مسلم تحریک نسواں'' کے مطالبات کی تائید اس لیے بھی نہیں کرتے کہ وہ سمجھتے ہیں یہ خواتین نسوانیت (Feminism) کے تمام تصورات

اور اصلاحیں مغربی فکر و فلسفہ سے اخذ کرتی ہیں۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن وسنت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ عورت الہامی پیغام کی تعبیر وتشریح نہیں کرسکتی اور یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ اسلام کے ابتدائی معاشرے کی تعمیر وتشکیل میں عالمہ خواتین نے کارہائے نمایاں ادا کیے ہیں چنانچہ اسلامی تاریخ میں چند مسلم اہل علم خواتین ایسی ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھا ہے ان میں عائشہ عبدالرحمٰن (1998) جو بنت الشاطی کے نام سے معروف تھیں۔ جنہوں نے قاہرہ میں تعلیم حاصل کی بعد ازاں وہاں کئی برس عربی ادب کی استاذ رہی اور پھر مراکش میں اسلامیات کی پروفیسر رہیں۔

پہلی مسلم خاتون ہیں جن کے خیال کے مطابق قرآن مجید کو اس کے زمانہ نزول اور حالات نزول کے تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ اسی طرح وہ قرآن پاک کی قرأت اور روحانی مطالعہ پر بھی زور دیتی رہیں اس انداز فکر کو ہم ابتدائی تفاسیر پر تنقیدی نظر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور عالمہ خاتون جن کا نام ناظرہ زین العابدین (1908-1976) تھا جو لبنان سے تھیں اور شیخ سید زین العابدین جو 1920ء میں لبنان کی کورٹ آف اپیل کے صدر تھے کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے 1928ء میں اس موضوع پر کتاب لکھی جس میں انہوں نے عورت کے فروتر مقام کے حوالے سے اہل مذہب پر تنقید کی اس طرح مصر کی زینب الغزالی (1917) معاصر تاریخ میں وہ واحد خاتون تھیں جنہوں نے نسوانی پہلو سے قرآن پاک کی مکمل تفسیر لکھی ہے۔

عصر جدید میں جو خواتین بطور خاص اس نقطہ نظر کی داعی ہیں ان میں نمایاں تر مصر کی ...... ہبہ رؤف عزت اور افریقہ نژاد امریکی خاتون امینہ ودود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امینہ ودود ان دنوں ورجینیا کامن ویلتھ یونیورسٹی آف امریکہ کے شعبہ فلسفہ والہیات کی استاد ہیں ان کی کتاب قرآن اور عورت جو اصلاً ان کا Ph.D کا

مقالہ ہے اور کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ امینہ ودود کی یہ کتاب جدید عہد کی خواتین کی زندگی سے قرآن کے تعلق کو واضح کرتی ہیں امینہ نسوانی حوالے سے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتی ہیں۔

''میرا ایمان ہے کہ قرآن مجید جدید مسلم معاشرے کی عورت کے حالات کا بھی اسی کامیابی سے لحاظ رکھتا ہے جس طرح اس نے چودہ صدیاں پہلے بنیادی مسلمان معاشرے کی عورت کا لحاظ رکھا ہے۔ اگر جدید عورت کو ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن کی تفسیر کی جائے تو اس حقیقت کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح قرآن کی افادیت بھی واضح ہوتی ہے۔ ایسی تعبیر جو قرآنی ہدایات کو صرف بنیادی اسلامی معاشرے کے مخصوص تناظر اور الفاظ کے ظاہری معنی کی نقالی تک محدود رکھتی ہے زندگی بلکہ دراصل قرآن کے ساتھ ناانصافی ہے۔

امینہ ودود کے نزدیک تمام روایتی تفاسیر چاہے ان کا تعلق دور جدید سے ہو یا قدیم سے مردوں نے لکھی ہیں لہٰذا انہوں نے یا تو نسوانی تجربات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے یا انہیں مردانہ تناظر میں دیکھا اور لکھا ہے لہٰذا ایسی تفاسیر کو مکمل اور جامع کیسے کہا جا سکتا ہے جو مسلم معاشرے کی نصف آبادی کے مسائل کو نظر انداز کر دے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ردِ عمل کے طور پر مسلم معاشروں میں عورت کی کمزور حیثیت کو بنیاد بنا کر اسلام اور قرآن پر تنقید کی جاتی ہے ایسے لوگ متن اور تفسیر میں فرق کرنے میں خود ناکام رہتے ہیں اور الزام کلام الٰہی پر دھرتے ہیں لہٰذا ایک مکمل (Holistic) اور جامع تفسیر وہ ہے جو جدید سماجی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی مسائل بشمول خواتین کے معاملات کو پیش نظر رکھ کر لکھی جائے۔ [۱۸]

عورت کا معاشرتی مقام ومرتبہ

اسلام نے عورتوں کو جس معاشرتی وسماجی مقام سے نوازا ہے اس کا اندازہ ان آیات کریمہ اور احادیث نبویہ سے ہوتا ہے جن میں مسلمان عورت کو وہ مقام رفیع دیا گیا ہے جس کا مقابلہ مغرب کے معاشرے شاید صبح قیامت تک نہ کرسکیں۔

ظہور اسلام سے قبل عرب معاشرہ میں بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اسلام نے اس مکروہ اور ظالمانہ رسم کا خاتمہ کر دیا بلکہ آج کے دور میں بھی بے شمار معاشروں میں ابھی تک بچیوں کو زندہ درگور کر دینے کا رواج موجود ہے مثلاً عالمی نشریاتی ادارے B.B.C نے کچھ عرصہ قبل ایک رپورٹ تیار کی جس کا موضوع تھا ''اسے مرنے دو'' (Let her die) بی بی سی کی ایک خاتون رپورٹر (Emy Bedcenem) نے برطانیہ سے ہندوستان میں آکر اس موضوع پر تحقیقات کیں اور یہ رپورٹ تیار کی جسے سٹار ٹی وی پر بھی کئی مرتبہ دکھایا گیا ہے اس رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں روزانہ تین ہزار حمل ضائع کر دیے جاتے ہیں۔ والدین بچے کی جنس معلوم کرتے ہیں جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ بچی پیدا ہونے والی ہے تو حمل ضائع کروا دیتے ہیں۔ ان اعداد وشمار کی رو سے ہندوستان جیسے خود کو جمہوری روایات کا پاسدار کہلوانے والے ملک میں ہر سال تقریباً دس لاکھ بچیوں کو قتل کیا جارہا ہے تامل ناڈو اور راجستھان جیسی ریاستوں میں ایسے بورڈ اور پوسٹر نظر آتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے کہ ''پانچ سو خرچ کریں اور پانچ لاکھ بچائیں''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے یا بچی کی جنس معلوم کرنے کیلئے پانچ سو روپے طبی معائنے پر خرچ کریں اور بچی کی تعلیم وتربیت اور جہیز پر اٹھنے والے پانچ لاکھ کے اخراجات بچائیں شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد کم ہے جبکہ اسلام کے معاشرے میں اولاد کا قتل گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ قرآن مجید

میں واضح طور پر ارشادِ ربانی ہے "اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی درحقیقت ان کا قتل ایک بہت بڑی خطا ہے۔ ۱۹

ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اپنی دو بیٹیوں کی اچھی طرح پرورش کی اور ان کا خیال رکھا اور محبت کے ساتھ پالا وہ شخص جنت میں داخل ہوگا۔

اسلام نے عورت کو بیٹی کی حیثیت سے پیش کیا تو اسے ماں باپ کی بخشش کا باعث بنا دیا اس طرح عورت کو ماں کی حیثیت سے پیش کیا تو اس کی خدمت کو حصولِ جنت قرار دیا ارشاد نبوی ہے

"واعلمو انَّ الُجنة تحت اقدام الامهات"

جان لو کہ تمہاری جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسی طرح بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کا درس دیا گیا ہے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"خیر کم خیر کم لاهلهٖ وانا خیر کم لاهلی"

تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر (اہلیہ اور خاندان) کے لیے بہتر ہے اور میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہوں۔

اسلام میں بالغ عورت کو نکاح کے معاملے میں رضامندی کا اختیار دیا گیا ہے ایک حدیث کے مطابق ایک عورت کا نکاح اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف کر دیا وہ عورت شکایت لے کر نبی پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ ﷺ نے اس نکاح کو فسخ فرما دیا۔ ۲۰

اسلام عورت کو بھرپور معاشرتی مقام اور مرتبہ سے نوازتا ہے اور اسے خاندان کی بنیادی اکائی قرار دے کر اس کے وجود کو معاشرے کے لیے باعث رحمت

بناتا ہے اور اس کے ذمے آنے والی نسلوں کی تربیت کی ذمہ داری لگاتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ اپنے زمانے کی تاریخ میں اپنے کردار کی بدولت ممتاز ترین مقام کی حامل تھیں اپنے محاسن و فضائل کی بدولت انہوں نے ایسا مقام چھوڑا جس کا آئندہ کی نسلوں میں عزت ووقار سے تذکرہ کیا گیا۔

خروج مدنی کی بیوی حمیدہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں جو 24 سال تک جنگی مہمات میں مصروف رہا تن تنہا اپنے نوعمر لڑکے کی ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا کہ اس لڑکے نے بڑے ہوکر اپنے دور کے علمائے فقہ میں نمایاں ترین مقام حاصل کیا۔

ان دلائل وشواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام مسلمان عورت کو معاشرتی سرگرمیوں کی اجازت بھی مرحمت فرماتا ہے اور اس سلسلہ میں اس کے اندر مسابقت کا جذبہ پیدا کر کے دیگر خواتین کو ترغیب بھی دلاتا ہے کہ نسلوں کی تیاری اور تربیت ماؤں کی گود سے وابستہ ہے۔ ماں اگر حضرت ہاجرہؓ جیسی ہو تو بیٹا اسماعیل علیہ السلام جیسا پیدا ہوتا ہے اور اگر ماں فاطمۃ الزہراءؓ جیسی ہو تو بیٹا امام حسین علیہ السلام جیسا پیدا ہوتا ہے۔

مسلمان عورت فکر اقبال کی روشنی میں

علامہ اقبال فرماتے ہیں مسلمان عورت کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ بھی معاشرہ اور زندگی میں ایسی شان پاکبازی کے ساتھ رہنا چاہیے کہ اس کی طہارت کے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوسکیں اور اس کے پرتو سے حریم کائنات اس طرح روشن رہے کہ جس طرح ذات باری تعالیٰ کی تجلی حجابات کے باوجود کائنات پر پڑ رہی ہے فرماتے ہیں کہ:

ضمیر عصر حاضر بے نقاب است — کشادش در نمود رنگ آب است

جہاں تابی زنور حق بیاموز — کہ او با صد تجلی در حجاب است

اس طرح علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ دنیا کی سرگرمیوں کی اصل ماؤں کی گود ہے۔ان کی ذات امین ممکنات اور انقلاب انگیز تخیلات کی حامل ہے جو قومیں ماؤں کی قدر نہیں کرتیں ان کا نظام زندگی سنبھل نہیں سکتا۔علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں آزادی نسواں کی تحریک کا اس لیے حامی نہیں بن سکتا کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز میں عورتوں کی غلامی ہے۔اس سے ان کی مشکلات آسان نہیں بلکہ اور پیچیدہ ہو جائیں گی۔جس علم سے عورت اپنی خصوصیات کھودیتی ہے ''وہ علم نہیں بلکہ عورت کے حق میں موت ہے۔''

مغرب جو صنفی پاکیزگی کے خاتمہ اور عورت کی بے لگام آزادی کا داعی ہے اپنے معاشرے کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر پریشان ہے کیونکہ اس کا نتیجہ مغرب کے خاندانی نظام کی تباہی کی صورت میں نکل رہا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں تفوق و برتری (Uper Hand) کس کو حاصل ہے۔مرد کی فضیلت و برتری صنفی یا نسلی اعتبار سے نہیں بلکہ عورت کے حیاتیاتی،عضویاتی،فرق اور خطرات کی وجہ سے اس کے حقوق و معالج کی رعایت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔نگرانی یا فوقیت ایسی چیز نہیں جو محض عورت کے سپرد کردی جائے۔

علامہ اقبال مغرب کے نام نہاد '' آزادی نسواں '' کے نعرہ کی پرواہ کیے بغیر مسلمان عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی وکالت کرتے ہیں اور عورت کی حفاظت کے عنوان سے کہتے ہیں۔

اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

یہ نظم درحقیقت حدیث پاک ''لن یفلح قوم ولوا علیھم امراۃ'' کی ترجمانی کرتی ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں اے مسلمان عورت زمانے کی نگاہوں سے چھپ جا اور بے حیا نظروں سے اپنی حفاظت فرما تا کہ تیری گود میں وقت کا حسین پیدا ہو سکے۔ فرماتے ہیں۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

امام حسین جیسا مرد مجاہد اور امام حسین جیسا مرد میداں صرف اسی عورت کی کوکھ سے جنم لے سکتا ہے جس کی زندگی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی پاکیزہ سیرت کی تابندگی سے دمک رہی ہو۔

یوں تو مسلمان عورت کے مقام و مرتبہ کے اور بھی کئی ایسے پہلو ہیں جن پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے مگر طوالت سے بچتے ہوئے صرف انہی الفاظ کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے پر اکتفاء کرر ہا ہوں کہ مغرب کی آزاد منش عورت مادی ترقی کی جتنی بھی بلندیوں پر پہنچ جائے وہ سکون قلب، عزت اور تحفظ سے محروم رہے گی، جبکہ مسلمان عورت اگر اسلامی تعلیمات کے زیور سے خود کو آراستہ کرلے تو وہ دنیا بھر کی عورتوں کیلئے نمونہ عمل و کردار (Role Model) بن کر قیادت نسواں کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔

مصادر و مراجع

۱۔ پیدائش باب دوم ۲۔ عہد نامہ قدیم باب واعظ

۳۔ پہلا خط باب دوم ۴۔ پیدائش باب سوم

۵۔ اولڈ برگ کی کتاب Budda pageno 149-n5

۶۔ روز نامہ نوائے وقت 9 ستمبر 2006ء

۷۔ قرآن مجید سورۃ نحل آیت 58-59

۸۔ عرب کا چاند صفحہ 35 تا 37

۹۔ civilization de arbs. page 372-373

۱۰۔ فتح الباری جلد 10 صفحہ 405 از ابن حجر عسقلانی

۱۱۔ اسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ جلد 4 صفحہ 433 از ابن اثیر الجزری

۱۲۔ سنن دارمی بیروت دار الاحیاء

۱۳۔ The life of Muhammad 1930 Edrmengum

۱۴۔ Christianity, Islam and nagro race

۱۵۔ Muhammad the Prophet of Islam

۱۶۔ قرآن مجید کی سورہ نور۔ آیت 24

۱۷۔ اسلام میں خواتین کے حقوق صفحہ 42 تا 44 از ڈاکٹر ذاکر نائیک

۱۸۔ جدید مسلم تحریک نسواں از حیفا جواد

۱۹۔ قرآن مجید سورۃ بنی اسرائیل آیت 17 تا 31

۲۰۔ صحیح بخاری از امام محمد بن اسماعیل البخاری

سپر انسانوں کی تیاری کے عمل

انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت

26 دسمبر 2002ء کو کلوننگ کے ذریعے انسانی بچی ''حوا'' کی تخلیق کی خبر نے اقوامِ عالم کے اصحابِ فکر و دانش کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور حیرت اس بات پر کی جارہی ہے کہ غاروں کی تاریکیوں میں بغیر لباس کے رہنے والا انسان علم کی بدولت تخلیق کے عمل میں مخل ہونا شروع ہو گیا ہے۔ انسانی کلوننگ دراصل صدیوں سے جاری سائنسی تحقیقات کے ارتقائی عمل اور انسان کی جستجوئے ذوق کی مظہر ہے جس نے ایک طرف سائنسدانوں کیلئے غور و فکر اور تدبر کے مزید ہزاروں دروازے کھول دیئے ہیں تو دوسری طرف ان لوگوں کو جو الہامی ہدایت سے راہنمائی لیے بغیر اپنی زندگی کی کسی سمت کا تعین نہیں کرتے، سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ یہ سائنسی ایجادات کہیں ربانی ہدایت کے دائرے سے باہر تو نہیں ہیں؟ اسی امر کا جائزہ لینے کیلئے یہ سطور سپرد قلم کی جارہی ہیں کہ دیکھا جائے انسانی کلوننگ کیا ہے اس کا پس منظر کیا ہے نیز اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

کلوننگ کیا ہے؟(What is cloning)

ایسے تمام جاندار جن میں افزائش نسل صرف اور صرف جنسی طریقے سے ہوتی ہے ان جانداروں کی عام جنسی طریقے سے ہٹ کر غیر جنسی طریقے سے حاصل کردہ نسل کو کلون (clone) کہتے ہیں۔ یہ ایک مصنوعی طریقہ تولید ہے۔ یہ ایک ایسی ٹیکنالوجی ہے جس کے تحت کسی جانور یا انسان جیسی نقل تیار کی جاسکتی ہے۔ کلوننگ کے ذریعے پیدا ہونے والا بچہ اپنے باپ کی کاربن کاپی ہوتا ہے۔ کلوننگ کو مزید

آسان فہم انداز میں اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جس طرح ایک وڈیو یا آڈیو کیسٹ کی ماسٹر کاپی سے ریکارڈ کے ذریعے بہت ساری مزید کاپیاں بنائی جاسکتی ہیں جن میں وہی آواز، سر اور اتار چڑھاؤ ہوتا ہے جو اصل کاپی میں ہے تقریباً اسی سے ملتے جلتے عمل کو کلوننگ کہتے ہیں جس میں سپر انسانوں کی تیاری کا جامع منصوبہ بھی شامل ہے۔

انسانی کلوننگ کا پس منظر

اس بات سے ہر صاحب علم واقف ہے کہ ریڑھ کی ہڈی نہ رکھنے والے حیوانات جیسے ستارہ مچھلی جنسی اختلاط کے بغیر ہی اپنے بچے آپ پیدا کرتی ہے۔ اس صورتحال کے علم میں آنے کے بعد سائنسدانوں نے اس پہلو پر کام کرنا شروع کر دیا کہ ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے اور دودھ دینے والے جانوروں نیز تمام جاندار اشیاء سے جنسی اختلاط کے بغیر بچے پیدا کیے جائیں چنانچہ 1950ء میں پہلی دفعہ بیل کی منی (semen) مصنوعی افزائش کیلئے استعمال کی گئی پھر کچھ عرصہ بعد امریکی سائنسدانوں رابرٹ برگز اور تھامس کنگ نے مینڈک کے بچوں کے خلیوں سے مینڈک کے مزید بچے بنائے لیکن جب ان بچوں کے ابتدائی اور پہلے مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہونے کا وقت آیا تو وہ سب کے سب مر گئے۔ سائنسدانوں کی جدوجہد جاری رہی جس میں 1980ء کی دہائی میں جا کر انہیں کامیابی ہوئی۔

ڈولی کی پیدائش

1977ء میں کلوننگ کا عمل ایک بھیڑ پر آزمایا گیا تھا جس میں سینکڑوں تجربات کے بعد جا کر انہیں کامیابی ہوئی۔ ایک بھیڑ کو کلون کیا گیا جس کا نام ''ڈولی'' رکھا گیا۔ یہ کارنامہ ایڈنبرا کے نزدیک واقع ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اسکاٹش سائنسدان ایان ولمٹ نے اپنے ساتھی سائنسدانوں کے ہمراہ سرانجام دیا۔ ڈولی کی

کلوننگ کا عمل اس طرح وجود میں آیا کہ سائنسدانوں نے سوچا کہ جس طرح درخت کے ایک بیج میں پورا درخت بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اسی طرح بھیڑ کے ایک تولیدی خلیے میں ایک مکمل بھیڑ بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے چنانچہ انہوں نے بالغ بھیڑ کے تولیدی گلینڈ سے ایک خلیہ حاصل کیا پھر بھیڑ کے اس میمری سیل کو لیبارٹری میں رکھ کر اس کی نشوونما کی بعد ازاں جب اس سیل کو تقسیم کیا گیا تو سیلوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ہر سیل (cell) پہلے سیل کی بالکل کاپی تھا۔ پھر ایک دوسری بھیڑ سے بیضہ (egg) لیا گیا جسے ایک لیبارٹری ڈش میں اس طرح رکھا گیا کہ مردہ نہ ہونے پائے۔ پھر انڈے کے مرکزہ (Nucleus) کو انڈے سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد میمری سیل اور انڈے کو بجلی کے اسپارک کے ذریعے ملا دیا گیا جس بھیڑ سے بیضہ لیا گیا ایمبریو (Embryo) کو اس بھیڑ کے جنین میں منتقل کر دیا گیا جس کے نتیجے میں ایمبریو (یعنی بچہ دانی کے اندر حمل کے بعد بچے کی پہلی حالت) بننا شروع ہو گئی اور مقررہ مدت کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ یہ بچہ اس بھیڑ کا ہم شکل تھا جس سے میمری سیل حاصل کیا گیا تھا۔ اس بچے کا نام ڈولی رکھا گیا۔ یوں اس سارے عمل میں کسی مرحلہ پر نر کا کوئی کردار نہ تھا۔ واضح رہے ڈولی کیلئے سات سو کے قریب تجربات کیے گئے جن میں سے صرف ایک تجربہ کامیاب ہوا۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی

ڈولی کی کلوننگ کے بعد سائنسدانوں نے کلوننگ کی بہتات (Multiplicity of Cloning) کی پیشین گوئی کی۔ ڈولی کا تجربہ انسانی کلوننگ کیلئے محرک (Motive) بنا۔ چنانچہ ٹیسٹ ٹیوب بی بی کیلئے تجربات ہونے لگے۔ ٹیسٹ ٹیوب طریقہ تولید کے بارے میں پنجاب یونیورسٹی میں مالیکولر بیالوجی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ایس رضی الدین لکھتے ہیں۔

''شوہر کا تولیدی جرثومہ (sperm) اور بیوی کا بیضہ (egg) لے کر ایک ٹیسٹ ٹیوب میں رکھ کر ایک خاص ماحول میں اس کی افزائش کرتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب میں ہی آپ اس انڈے کو ایک سے دو دو سے چار چار سے آٹھ اور آٹھ سے بارہ خود مختار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تقسیم کا یہ عمل کئی گنا آگے تک جا سکتا ہے۔ جن ماؤں کے ہاں بیک وقت دو دو، چار چار بلکہ چھ چھ جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں یہی ہوتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں انڈہ کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ان جڑواں بچوں کی شکلیں بھی آپس میں حیرت انگیز حد تک ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ جو چیز ماں کے پیٹ میں تکمیل پاتی ہے سائنسدان اسے ٹیسٹ ٹیوب میں مکمل کرتے ہیں۔ بعد ازاں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا یہ افزائش شدہ انڈہ کسی دوسری خاتون کے رحم میں رکھا جاتا ہے (اور اسی خاتون کے رحم میں بھی رکھا جا سکتا ہے) جہاں یہ صرف خوراک حاصل کرنے کے مراحل طے کرتا ہے۔ اگر ٹیسٹ ٹیوب میں ایک خاتون اور مرد کے افزائش شدہ تولیدی مادے کو تقسیم کر کے بارہ مختلف انڈوں کی صورت میں بارہ مختلف خواتین کے رحم میں رکھا جائے تو اس سے بارہ ایک جیسے بچے پیدا ہوں گے بلکہ ان کی تعداد چالیس کروڑ تک بڑھائی جا سکتی ہے۔''

واضح رہے کہ ٹیسٹ ٹیوب میں تخلیق کے مراحل طے کرنے والے بچے اور انسانی کلوننگ کے عمل سے گزرنے والی بچی حوا میں فرق ہے۔

اولاً: ٹیسٹ ٹیوب میں نر اور مادہ دونوں کے خلیوں کے ملاپ سے بچہ جنم لیتا ہے جبکہ انسانی کلوننگ میں صرف مادہ یا صرف نر کے خلیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

ثانیاً: ٹیسٹ ٹیوب میں خلیہ نطفے سے حاصل کیا جاتا ہے جبکہ کلوننگ میں خلیہ بدن کے کسی بھی حصے سے لیا جا سکتا ہے۔

انسانی بچی حوا کی تخلیق

ٹیسٹ ٹیوب بی بی کے کامیاب تجربے نے سائنسدانوں کے جذبہ تجسس کو مزید مہمیز لگائی اور انہوں نے انسانی کلوننگ کیلئے منصوبہ بندی (Planning) شروع کر دی جس کے نتیجے میں ہم نے جون 2000ء میں اچانک یہ دھماکہ خیز خبر سنی کہ سائنسدانوں نے انسانی جسم میں موجود جینز کا کوڈ دریافت کرلیا ہے۔ یعنی وہ اسے ڈی کوڈ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جینوم (Genome) کا 97 فیصد نقشہ بھی تیار کرلیا ہے۔ نیز سائنسدانوں نے جین کے لیٹرز کو 85 فیصد تک درست سیکوئنس میں رکھ لیا ہے اور جس دن وہ ان لیٹرز کو 100 فیصد درست کرلیں گے اسی وقت وہ بڑی آسانی اور تسلسل کے ساتھ انسانی بچی کلون کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جنٹیک انجینئرنگ کے ذریعے انسانی کلوننگ کا یہ عمل جاری رہا یہاں تک کہ پھر 26 دسمبر 2002ء کو دنیا بھر کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے یہ چونکا دینے والی خبر سنی اور پڑھی گئی کہ ایک فرانسیسی بائیو کیمسٹ ''برجیسٹ بوائزلر'' نے ایک انسانی بچی کلون کی ہے جس کا نام ''حوا'' رکھا گیا ہے۔

انسانی کلوننگ کا طریقہ کار

انسانی کلوننگ کے اصل طریقہ کو جاننے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے، کہ انسانی جسم میں پانچ ارب خلیے ہوتے ہیں۔ ہر خلیے میں ایک مرکزہ (Nucleus) ہوتا ہے اس میں سے ہر مرکزہ کروموسومز کے 23 جوڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی کل 46 کروموسومز ہوتے ہیں۔ یہ 46 کروموسومز 80 ہزار سے لے کر ایک لاکھ جینز (Genes) سے مل کر بنتے ہیں۔ جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی ماں سے 23 کروموسومز حاصل کر کے 46 کروموسومز کا عدد پورا کرتا ہے۔

سائنسی تحقیق کے مطابق ہر جین مخصوص جسمانی خواص جسم کے مختلف حصوں

افعال اور ہمارے رویوں پر اپنے اثرات مرتب کرتے یا انہیں کنٹرول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے جسم کا ایک جین ایسا ہے جو ہماری جلد اور بالوں کی رنگت متعین کرتا ہے یا ہماری جسمانی ساخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہماری انگلیوں کے پوروں پر جو نقشہ کھنچا ہوا ہے وہ بھی ایک جین کی بدولت ہے۔ ہماری عمروں کے تعین میں ایسے ہی کسی جین کا کوئی کردار ہوتا ہے اور ہمارے رویوں میں جو جارحیت، غصہ اور تشدد یا محبت، امن پسندی اور عدم تشدد نظر آتا ہے اس میں کسی جین کا کردار مضمر ہوتا ہے۔ سائنسی تحقیق کے مطابق ہمارے جگر کے افعال چار ہزار جینز کنٹرول کرتے ہیں۔ غرض یہ جینز ہی ہیں جو ہماری ذہنی، نفسیاتی اور ظاہری شخصیت کو بناتے ہیں اور جینز میں معمولی تبدیلی کی وجہ سے ہماری شخصیت میں انفرادیت اور امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ جنیاتی سائنس میں رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کی خبر غالب کو شاید برسوں قبل ہوگئی تھی جس کا ذکر انہوں نے یوں کیا کہ

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

واضح رہے کہ جینز کے اندر D.N.A ہوتے ہیں۔ ابھی تک جو انسانی D.N.A دریافت ہوئے ہیں ان کی تعداد تین ارب بتائی جاتی ہے۔ یہ تعداد انسانی ڈی، این، اے کے بنیادی جوڑوں کی ہے۔ انسانی جینز کی تعداد انسانی D.N.A کی تعداد کا بیسویں سے پینتیسواں حصہ ہوتی ہے۔ انسانی جسم کے ہر خلیے میں ہر شخص کی منفرد اور خصوصی حیاتیاتی معلومات ہوتی ہیں۔ اس کے مجموعہ کو جنوم (Genome) کہتے ہیں جو ہر آدمی کا منفرد اور یکتا حیاتیاتی خاکہ ہوتا ہے۔ یہ جینوم چونکہ جینز کے ایک مخصوص مجموعہ کا نام ہے اور جینز مختلف انسانی D.N.A کے مجموعہ سے بنتے ہیں اس لیے انسانی زندگی کی بنیاد D.N.A پر مبنی ہے۔

انسانی کلوننگ ٹیکنالوجی کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس چیز کو ممکن بنایا جائے کہ اگر کسی انسان کا ہم شکل (Duplicate copy) بنانا ہو تو وہ آسانی سے بنایا جاسکے اور وہ اصل سے اس قدر مشابہ ہو کہ اصل ہی معلوم ہو۔ کلوننگ ٹیکنالوجی نے انسانی کلون تیار کرنے میں تولید کے روایتی طریقہ کار کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے یعنی روایتی طریقہ تولید میں نر اور مادہ کے ملاپ کے ذریعے تولیدی جرثومہ (Sperm) اور بیضہ (Egg) کا ملنا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ ٹیسٹ ٹیوب بی بی میں ہوا لیکن انسانی کلوننگ میں نر اور مادہ کو ایک دوسرے کی احتیاج سے بے نیاز کر کے تولید کے عمل (process) کے ذریعے کسی بھی تنہا جاندار کے ایک غیر تولیدی سیل کو لیبارٹری میں رکھ کر مکمل ہم شکل انسان بنایا جاسکتا ہے کیونکہ جدید سائنس کے نزدیک ہر جاندار کے خلیے میں مکمل جاندار بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ کلوننگ کے ذریعے پیدا ہونے والا بچہ صرف نر یا صرف مادہ سے جنم لیتا ہے۔ اس لیے اس کے والدین بھی نہیں ہوتے بلکہ وہ "One parent" بچہ کہلاتا ہے۔

انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت

واضح رہے کہ اس مقالہ میں صرف انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ اس کے جواز اور عدم جواز کے دلائل بیان کرنے کے بعد ایک تجزیہ پیش کیا جارہا ہے جہاں تک حیوانی یا نباتاتی کلوننگ کا تعلق ہے تو وہ جمہور علماء کی رائے کے مطابق شرعاً جائز ہے۔ اس کے ذریعے جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اس جانور کی مثل ہوتا ہے جس کا بیضہ انثیٰ لیا جائے تو وہ اگر حلالی جانور سے لیا گیا تو پیدا ہونے والا بچہ حلال ہوگا تاہم انسانی کلوننگ کی شرعی حیثیت کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آچکے ہیں۔ جمہور علماء مطلقاً اس کو حرام قرار دیتے ہیں۔ کچھ اسکالرز جزوی طور پر اس کے جواز کے قائل ہیں جبکہ ایک مختصر طبقہ اس کی حلت کا بھی قائل ہے۔

انسانی کلوننگ کے جواز کے دلائل

وہ اہل علم جو انسانی کلوننگ کے جواز کے قائل ہیں وہ درج ذیل دلائل دیتے ہیں۔

1- حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں کسی مرد کا کردار نہیں ہے وہ دونوں بغیر باپ کے پیدا ہوئے لہٰذا صرف نر یا صرف مادہ کے خلیے سے انسان کلون کرنے کا عمل درست ہوگا۔

2- حضرت حوا علیہ السلام کی تخلیق بھی چونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ ان کی تخلیق میں بھی کسی دوسری شخصیت کا عمل دخل نہیں ہے اس لیے ان کے واقعہ سے بھی انسانی کلوننگ کے جواز کا استشہاد کیا جا سکتا ہے۔

3- اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں اعلان فرمایا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ [1]

ترجمہ: اے لوگو! اس رب سے ڈرو جس نے تم کو نفس واحد (Single cell) سے پیدا فرمایا۔

اس آیت سے بھی استنباط کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ انسان کی تخلیق ایک سیل سے ہوئی اس لیے انسانی کلوننگ کا عمل جائز ہوگا کیونکہ اس میں بھی ایک ہی سیل سے بچی کی کلوننگ کی گئی۔

4- مرغی کے انڈے اور بعد ازاں چوزے نکلنے کے عمل تک نر کا کوئی کردار شامل نہیں ہوتا۔

5- اگر ایک عورت کا ''Ovum'' جو خوردبین کے بغیر نظر نہیں آ سکتا دوسری عورت میں کسی بھی طریقے سے منتقل ہو جائے اور وہ حاملہ ہو جائے تو یہ درست ہوگا۔ لہٰذا انسانی کلوننگ بھی جائز ہوگی۔

انسانی کلوننگ کے عدم جواز کے دلائل

اب ان اسکالرز کے دلائل پیش کیے جا رہے ہیں جو انسانی کلوننگ کے عدم جواز کے بڑی شدت کے ساتھ قائل ہیں۔

1- انسان کلوننگ میں چونکہ مرد کا خلیہ جسم کے کسی بھی حصے سے لے کر اس کا جین تیار کروا کر عورت کے رحم میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس سارے عمل میں مرد کے نطفے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ اصل عمل دخل خلیے کا ہوتا ہے اس لیے یہ طریقہ تولید قرآن میں بیان کردہ طریقہ تولید کے سراسر خلاف ہے۔
قرآن مجید کی سورہ دھر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ؁۲

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا فرمایا۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۪﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً ؁۳

ترجمہ: ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے پیدا فرمایا، پھر پانی کی بوند کیا ایک مضبوط ٹھہراؤ میں پھر ہم نے پانی کی بوند (یعنی نطفہ) کو خون کی پھٹک کیا۔
ان دونوں قرآنی آیات سے پتہ چلا کہ تولید انسانی میں نطفہ اصل چیز ہے اس لیے نطفے سے مخلوق کا پیدا کیا جانا ہی الوہی طریقہ تولید ہے نہ کہ خلیے یا گلینڈ کے ذریعے مخلوق کا پیدا ہونا جو غیر فطرتی طریقہ تولید ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیماتِ قرآن سے متصادم بھی ہے۔

2- عالم اسلام کی قدیم درسگاہ جامعۃ الازہر کے ممتاز عالم دین پروفیسر عبد المصطفیٰ نے انسانی کلون بنانے کی ٹیکنالوجی کو خلافِ شرع قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں لہٰذا یہ حرام

ہے۔ انہوں نے کہا کہ انسانی کلوننگ سے جرائم پیشہ افراد اور مصر کے فرعونوں کے کلون بھی تیار ہونے کا امکان ہے جس کے نتائج بڑے بھیانک ہوں گے۔

3- اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدائش انسانی کے عمل میں مرد و عورت کا کردار متعین ہے اور مرد کے کردار کو ختم کرنا سنت الٰہی کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔لہٰذا ایسی کوئی بھی کوشش منشاء الٰہی کے خلاف ہوگی۔

4- کلوننگ میں پیدا ہونے والے بچے کے ماں باپ کا کچھ علم نہیں ہوتا اور اس طرح کی تولید سے ایک بے شناخت قسم کی شخصیت وجود میں آئے گی تو والدین اپنی اولاد کو صنعتی پیداوار سمجھنے لگیں گے۔

5- انصانی کلوننگ عبث فی الخلق کے زمرے میں داخل ہے لہٰذا ناجائز اور خلاف شریعت ہے۔

6- انسانی کلوننگ کا عمل فطرتی طریقہ توالد وتناسل کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی خلاف شرع ٹھہرتا ہے۔

7- انسانی کلوننگ کے عمل کو جائز قرار دیا جائے تو پھر رحم کرائے کا مال اور ذریعہ معاش بن جائے گا۔ یہ سلسلہ انسانی معاشرت میں فساد پیدا کرے گا۔لہٰذا کسی صورت بھی جائز نہیں ہے۔ پھر یہ کہ جس عورت کے رحم میں سیل وغیرہ داخل کیا جائے گا وہ کسی مرد ڈاکٹر یا اجنبی عورت کے ذریعے ہی عمل میں آئے گا جس سے بے حیائی کو فروغ ملے گا اور حفاظت شرمگاہ کا عمل متاثر ہوگا۔

تجزیہ

کلوننگ کے جواز اور عدم جواز کے دلائل پڑھنے کے بعد اب راقم الحروف کا تجزیہ پیش خدمت ہے۔

جہاں تک سائنسی تحقیقات کا تعلق ہے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا یَعْقِلُوْنَ، یَتَفَکَّرُوْنَ اور یَتَدَبَّرُوْنَ کے الفاظ سے اہل دانش کو جھنجوڑا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور قدرت کی نشانیوں میں غور وفکر کیوں نہیں کرتے؟ لہٰذا سائنسی و علمی ترقی اور نئے نئے انکشافات تو جائز ہیں لیکن ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے بقول ''علم وہی نافع ہے جو ایمان کے تابع رہے'' یعنی بے لگام علم گمراہی کا باعث بن جاتا ہے۔

میرے نزدیک جہاں تک انسانی کلوننگ کا تعلق ہے علم کی حد تک تو اس بات کا جاننا جائز ہے کہ ایک انسانی خلیے سے بھی مکمل انسان کی تخلیق کا عمل وجود میں آسکتا ہے بلکہ ایک مومن کیلئے تو ایسا انکشاف اس کے ایمان کے دریا میں تلاطم برپا کرنے کے مترادف ہوگا۔ جب بندۂ مومن کو پتہ چلے گا کہ واحد خلیہ بھی تخلیق انسانی کی بنیاد بن سکتا ہے تو اس کیلئے خدا، وحی اور آخرت پر ایمان کیلئے نئے در کھلتے جائیں گے لیکن انسانی کلوننگ کے عمل کو بطور پیشہ اختیار کر کے مزید تجربات کرنا انسانی دولت اور صلاحیتوں کے ضیاع کے ساتھ ساتھ احکامات شریعت سے متصادم ہونے کی وجہ سے ناجائز، مکروہ اور حرام بھی ہوگا۔

لہٰذا انسانی کلوننگ کو بطورِ علم جاننا تو جائز ہوگا اور بطور پیشہ اپنانا انتہائی قبیح کیونکہ بطور علم جاننے سے اسلامی عقیدے کی صداقت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسانی کلوننگ کا انحصار چونکہ بنیادی سیل یا D.N.A پر ہی ہے جس کی تخلیق کا دعویٰ سائنسدانوں نے بھی نہیں کیا بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہی قرار دیا ہے۔ باقی رہا سائنسی عمل کے ذریعے انسانی بچی کا ایک خاص ماحول میں کلون ہونا تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مشرکین سے فرمایا کہ

تمہارے معبودان باطل کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے بلکہ فرمایا

لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا

وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

لہٰذا اس انسان کے بنیادی سیل یا D.N.A کی تخلیق کا دعویٰ سائنس دان کسی بھی مرحلہ پر نہیں کر سکتے کیونکہ کوئی متنفس قیامت تک اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حقیقتوں کو جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ انسانی کلوننگ سے قرآن مجید کی ان آیات کی صداقت پر بھی ایمان مزید پختہ ہوتا ہے جن میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ نیز کلوننگ ٹیکنالوجی عیسائیت کے اس عقیدے کا بطلان کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں اور اسلامی عقیدے کی تائید کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نر اور مادہ کے ملاپ کے بغیر بھی انسان کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسانی کلوننگ سے حیات بعد الموت کے اسلامی عقیدے کی بھی تصدیق ہوتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے مٹی میں گل سڑ کر مر جانے کے بعد اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں ہے ان کیلئے جواب یہ ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیث مبارکہ کے مطابق انسانی اعضاء مٹی میں مل کر ختم بھی ہو جائیں تو دم کے سرے پر پائی جانی والی ایک ہڈی باقی رہتی ہے جو دوسری حدیث کے مطابق رائی کے دانے کے برابر ہوتی ہے۔ بس اسی ہڈی سے انسان کی دوبارہ تخلیق کا عمل وجود میں آئے گا اور اب انسانی کلوننگ کے تجربہ نے مزید یقین دلا دیا کہ ایک انسانی خلیے سے دوبارہ انسانی تخلیق ممکن ہے۔

لیکن میرے نزدیک انسانی کلوننگ کی بطور پیشہ کسی صورت میں اجازت نہیں ہونی چاہیے اس کی روک تھام کیلئے تمام مسلم ممالک کو قانون سازی کرنی چاہیے کیونکہ اگر اس کے جواز کی ذرا سی بھی راہ تلاش کی گئی تو پھر اسلام کا فیملی سسٹم تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ خونی رشتوں کا تقدس پامال ہو جائے گا۔ اخوت، محبت اور الفت جیسے

جذبات دم توڑنے لگیں گے۔ نظام وراثت کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ ماں کی کوکھ کی بجائے شیشے کے ظروف میں پلنے والا انسان بیالوجیکل فادر کے باعث شفقت پدری سے محروم ہوگا اور اگر خدانخواستہ انسانی کلوننگ کا سلسلہ مزید پھیل گیا اور اسے قانونی تحفظ بھی مل گیا تو مجھے شدید خدشہ ہے کہ پھر زمانہ جاہلیت کی طرح منڈیوں میں انسانوں کی خرید وفروخت ہوا کرے گی اور کچھ بعید نہیں کہ یہ ایک مکمل انسانی انڈسٹری کی صورت اختیار کر جائے جہاں برتنوں کی طرح انسانوں کی ڈیزائننگ ہوگی۔ انسانی کلوننگ ایک مکمل کمرشل آرٹ کی صورت اختیار کر جائے گی اور پھر تمام اخلاقی، تہذیبی، روحانی بلکہ انسانی قدروں کا جنازہ اٹھے گا اور کوئی ماتم کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ اعلیٰ بچے (Super Kids) پیدا کرنے کی ہوس انسان سے انسان کی پہچان بھی چھین لے گی اور ہوسناکی کا وہ ہولناک سیلاب آئے گا جو تمام عائلی، سماجی اور معاشرتی حدود وقیود کے بندھنوں کو توڑ کر رکھ دے گا اور خدا نہ کرے اگر ایسا ہوا تو پھر دیکھنا سائنسدانوں کی یہ گلوبل ویلج انسانی بستی تو نہیں ہوگی البتہ ہوس کا ایک ایسا آتشکدہ ضرور ہوگی جہاں ہر شخص نفس کے معبود کی پرستش کر رہا ہوگا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ایک تحقیقی، تعریفی اور تنقیدی جائزہ

دینی مدارس کا نظام و نصابِ تعلیم

دینی مدارس کی تاریخ پر طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو ان مدارس کا مبدأ مدینہ منورہ کی وہ صفہ درسگاہ ہے جس کے چبوترے پر بیٹھ کر معلم کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تلامذہ کے سینوں کو قرآن مجید کے اسرار و رموز سے منور فرما رہے تھے اور علم کی تابانیوں سے ان کے قلب و نظر کو تازگی بخش رہے تھے۔ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے فلسفہ کی روح پر اگر غور کیا جائے تو وہ بنیادی طور پر فروغ علم ہی ہے۔ فتح ایران کے وقت رستم ایران نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جھگڑے نہیں تھے تو تم نے کیوں ایران کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے؟ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے یہی جواب دیا تھا۔

”قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمٰتِ الْجَهَالَةِ اِلٰی نُوْرِ الْاِسْلَامِ
وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْکِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ“

ترجمہ: ہم اس لیے بھیجے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو جہالت کے ظلمت کدوں سے نکال کر اسلام کی ضیا پاشیوں (علم) کی طرف اور بادشاہوں کے پنجہ جبر و استبداد سے نکال کر عدل اجتماعی (Social Justice) کی طرف لاسکیں۔

اس طرح اسلام کی تحریک جہاں بھی پہنچی مسلمانوں نے ترجیحی بنیادوں پر علمی مدارس، دینی مراکز اور کتب خانے قائم کیے۔ چنانچہ بغداد، قرطبہ دمشق، حلب، موصل، مصر، بیت المقدس، بعلبک، نیشاپور اور خراسان مدارس و جامعات سے بھرے ہوئے تھے۔ انہی مدارس سے اٹھنے والی قیادت دنیا کی پیشوائی کا فریضہ سرانجام دیتی رہی بلکہ

یورپ کے کئی اہل علم وفن ان مدارس سے فیض یاب ہوئے اور مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں تو امام غزالیؒ، امام رازیؒ، امام سیوطیؒ، امام بیضاویؒ اور امام مرغینانی جیسے یکتائے روزگار اور آئمہ فن حکومتی تعلیمی اداروں میں نہیں بلکہ انہی دینی مدارس سے اکتساب علم کر کے کاروانِ انسانیت کی امامت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور اسلامی تاریخ کا ذرا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ہمارے دین کی بنیاد ہی یہ دینی مدارس ہیں۔

دینی مدارس کے خلاف ہونے والی سازش

حکومت پاکستان نے کچھ عرصہ قبل دینی مدارس آرڈیننس کے ذریعے دینی مدارس کا سروے شروع کیا تھا۔ ان کے اکاؤنٹس سے لے کر نصاب اور طریقہ تدریس تک کو تبدیل کرنے کیلئے انتہائی پیچیدہ سوالناموں پر مبنی فارم تیار کیے تھے۔ امریکہ نے حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کیا تھا کہ ''پاکستان کو اپنی حدود کے اندر سرگرم مسلح اسلامی گروپوں کو کچلنا ہوگا جو بین الاقوامی برادری کیلئے خطرہ بن چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان ایسے انتہا پسند گروپوں کے خلاف کاروائی کرے گا جو تشدد کے واقعات میں ملوث ہیں''۔

امریکی بے چینی کا سبب یہ ہے کہ اسلامی و جہادی تحریکوں کی اصل قوت محرکہ یہ دینی مدارس ہی ہیں۔ مزید یہ کہ دینی اداروں میں پڑھنے والے طلباء سرکاری اداروں میں زیر تعلیم طلباء سے تعداد کے لحاظ سے کہیں زیادہ ہیں اور وہ تمام ایک گہرے نظم میں پروئے ہیں۔ اس لیے امریکہ حکومت پاکستان کے ذریعے دینی مدارس کی روح کو کچلنے کیلئے ان کے نصابِ تعلیم کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ حکومتی اہلکاروں نے اس دلیل پر کہ دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء چونکہ زمانے کے ساتھ چلنے کی استعداد سے محروم ہوتے ہیں لہٰذا وہ ''یک رخے'' کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لیے دینی مدارس حکومتی تحویل میں لے کر ان میں حکومتی نصابِ تعلیم رائج کیا جانا چاہیے۔ یہ بڑی بھونڈی

دلیل ہے کہ دینی مدارس کے فاضلین زمانے کے حقائق کا گہرا ادراک نہیں رکھتے۔ دینی مدارس کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آج مشرق و مغرب میں جتنی بھی علمی ترقی ہوئی ہے ان کی اساس یہ دینی مدارس ہی ہیں۔

اسلامی تاریخ کے اہم دینی مدارس

ابن حوقل کا بیان ہے کہ اسلامی و عرب دنیا میں دینی مدارس کے ذریعے تعلیم و تعلم (Education and Literacy) کی ترقی یہاں تک تھی کہ سسلی ایک چھوٹا سا شہر تھا مگر اس میں چھ سو مدرسے تھے اور ان مدارس میں اتنے زیادہ طلباء زیر تعلیم تھے کہ ابو القاسم بلخیؒ کی روایت کے مطابق صرف ان کے اپنے مدرسہ میں تین ہزار طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جامعہ نظامیہ جو پانچویں صدی سے نویں صدی ہجری تک دنیا کی عظیم ترین دینی درسگاہ تھی اس میں باقاعدہ طلباء کی تعداد چھ ہزار رہتی تھی اور امام غزالیؒ جیسی یکتائے روزگار ہستی اس درسگاہ کی سربراہ تھی۔ اس کے علاوہ امام نعیمی کی روایت کے مطابق صرف دمشق میں فقہ و قانون (Law & Jurisprudence) کے مدارس و جامعات کا یہ عالم تھا کہ تریسٹھ (63) مدرسے فقہ شافعی کے باون (52) فقہ حنفی کے گیارہ (11) فقہ حنبلی کے اور چار (4) فقہ مالکی کے تھے۔ ان کے علاوہ بعض مدارس علم الطب (Medical Science) کے بھی تھے۔ امام ابن کثیرؒ ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھتے ہیں کہ 631ھ میں مدرسہ مستنصریہ کی تعمیر مکمل ہوئی جو کہ اس وقت تاریخ کی سب سے بڑی دینی درسگاہ تھی۔ اس میں چاروں فقہی مذاہب کے ماہرین و محققین فقہ و قانون کے شعبہ میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف تھے۔ دینی مدارس کی وجہ سے علوم میں شرح خواندگی سو فیصد تھی۔ قرطبہ شہر کے صرف ایک مشرقی محلہ میں ایک سو ستر (170) خواتین قرآن مجید کی کاتب (Calligraphers) تھیں۔ یہ اس دور کا دینی درسگاہوں کا کام ہے جب مغربی دنیا جہالت کی گھٹا ٹوپ

اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آج مغرب کی علمی تاریخ میں اس دور کو "زمانہ تاریکی" (Dark Ages) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسلامی مدارس میں ہونے والی علمی ترقی اور بعض اہم کتب

اسلامی تاریخ کی عظیم دینی درسگاہوں کا ذکر کرنے کے بعد اب ذرا ان کتب کا جائزہ لیتے ہیں جو دینی درسگاہوں سے فارغ التحصیل فضلاء نے اپنی تبحر علمی کی بدولت لکھیں اور صدیاں بیت جانے کے باوجود آج بھی صاحبان علم کو ان کتب پر ناز ہے۔

فقہ وقانون میں بہت سی کتب لکھی گئیں۔ امام ابوحنیفہؒ (متوفی 150ھ) نے دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہی بعض ایسی کتب لکھیں جو اہل علم کی راہنمائی کا باعث بنیں۔ آپ کے تلامذہ میں سے بالخصوص امام محمد بن حسن الشیبانی نے السیر الکبیر (Public International Law) اور السیر الصغیر (Private International Law) پر امام اعظمؒ کی فرمودہ تصنیفات مرتب کیں۔ جن پر امام سرخسیؒ نے "شرح السیر" کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل شرح لکھی اور پھر انہی امام سرخی کی تیس جلدوں پر مشتمل المبسوط علم قانون پر آج سے ہزار سال قبل لکھی ہوئی عظیم کتاب ہے۔ اس طرح زید بن علیؒ (المتوفی 120 ہجری) کی کتاب "المجموع" بھی بین الاقوامی قانون (International Law) پر مفصل کتاب ہے۔ پھر امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام اوزاعیؒ، امام شافعیؒ اور دیگر آئمہ فقہ وقانون نے مزید اس پر بھرپور مواد فراہم کیا جو علمی وقانونی تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

اس طرح "Comparative Case Law" جو دورِ جدید کا نہایت اہم قانون فن اور علمی موضوع ہے۔ اس پر دوسری صدی ہجری میں ہی باقاعدہ کام شروع ہو گیا تھا، بوسیؒ، شاطبیؒ، ابن رشدؒ اور سیموریؒ وغیرہ کی تصنیفات اس فن کے اعلیٰ پایہ کے نمونے ہیں اس کے علاوہ علم دستور (Constitutional Law) پر سب

سے پہلی باضابطہ دستاویزات حضورِ اکرم ﷺ کا تیار کردہ ''میثاق مدینہ'' (Pact of Medina) ہے جو 52 دفعات پر مشتمل ہے اور دنیا کا پہلا تحریری آئین (Written Constitution) ہے جو ابن ہشام، ابن اسحاق، ابوعبید، ابن سعد، ابن کثیر اور ابن ابی خیثمہؒ کے ذریعے ہم تک کامل شکل میں پہنچا ہے۔ بعد ازاں اسی موضوع پر الماوردی اور ابویعلیٰؒ کی ''الاحکام السلطانیہ'' امام غزالی کی ''نصیحۃ الملوک'' طرطوسیؒ کی ''سراج الملک'' اور الفارابی کی ''المدینۃ الفاضلۃ'' جیسی درسی کتب (Text Books) بھی معرض وجود میں آئیں اور اسلام کی آئینی و دستوری خدمات میں سے یہ بھی ہے کہ ریاست کے تینوں اعضاء (Organs) مقننہ (Legislature) عاملہ (Executive) اور عدلیہ (Judiciary) کو علیحدہ علیحدہ تشخص دیا گیا اور خلافت راشدہ کے دور میں انہیں ''اہل الحل والعقد، اولی الامر اور القضاء'' کے مستقل نام دیئے گئے تھے اور ان کے دائرہ ہائے کار بھی متعین ہو گئے تھے جبکہ مغربی علم دستور میں اس کا تصور بہت بعد میں فروغ پذیر ہوا۔ اس طرح ''Common Law'' پر باقاعدہ فقہی و قانونی مجموعات (Justice and Legal Codes) بھی اسلام کی دوسری صدی کے اوائل میں مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے جنہیں باقاعدہ حصص اور ابواب (Parts and Chapters) میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ عبادات (Religious Laws) مناکحات (Family Law) معاملات و معاہدات (Civil and Contractual Laws) عقوبات (Penal Laws) مالیات (Financial Laws) اور قضاء و شہادات (Procedural and Evidence Laws) وغیرہ کی باقاعدہ قانونی تقسیم بھی عمل میں آچکی تھی۔ ان کے بعد امام ابوحنیفہؒ کی کتب ''ظاہر الروایہ'' جنہیں ان کے شاگرد امام محمدؒ نے مرتب کیا اس کے علاوہ امام مالکؒ کی ''الموطاء'' امام شافعیؒ کی کتاب ''الام'' بعد ازاں فقہ حنفی میں

سرخسی کی "المبسوط" مرغینانیؒ کی "الھدایہ" ابن ہمامؒ کی "فتح القدیر" کاسانی کی "بدائع الصنائع" جیسی معرکۃ الآراء کتب وجود میں آئیں۔ فقہ مالکی میں ابن سحنون کی "المدونہ الکبریٰ" ابن جوزی کی "القوانین الفقہیہ" ابن فرحون کی "تبصرۃ الحکام" الخطاب اور الخرشیؒ کی "شرح المختصر" وغیرھا۔ اسی طرح فقہ شافعی میں امام نووی کی "المجموع" امام غزالیؒ کی "ابوجیز" بصیرؒ کی "النھایہ" وغیرہ لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ فقہ حنبلی میں ابن قدامہؒ کی "کتاب المغنی" اور ابن القیمؒ کی "اعلام المعوقین" ابن حزمؒ کی "المحلی" اور القرافیؒ کی "الفروق" وغیرہ جیسی نادر کتب معرض وجود میں آئیں۔

فقہ جعفریہ میں الحلیؒ کی "شرائع الاسلام" جواد مغیہؒ کی "فقہ الامام جعفر الصادق" وغیرہ جبکہ الجزیری کی کتاب "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" جیسی معرکۃ الآراء کتب لکھی گئیں۔ پھر Case Law میں فتاویٰ اور شرعی فیصلہ جات (Judical Decision) میں فتاویٰ قاضی خان، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ بزازیہ، فتاویٰ ابن تیمیہ، فتاویٰ امام نووی اور فتاویٰ امام سبکی جیسے مجموعات مرتب ہوئے پھر Financial and Taxation Law اور Administrative Law پر امام ابو یوسف اور یحییٰ بن آدم کی کتاب "الخراج" اور ابوعبد قاسم بن سلام کی کتاب "الاموال" اوائل اسلام کے عملی نمونے ہیں۔

درس نظامی کا تاریخی پس منظر

ہمارے زیادہ تر دینی مدارس میں حضرت نظام الدین کا مدون کردہ درسی نظام پڑھایا جاتا ہے یہ نصاب تعلیم گیارہویں صدی ہجری میں قصبہ سہالی (جو کہ لکھنو یوپی میں ہے) کے ایک مقتدر عالم دین ملا قطب الدینؒ نے تجویز کیا تھا اور اس مقصد کیلئے انہوں نے چند بنیادی کتب کا بھی انتخاب کیا تھا لیکن ان کی شہادت کی بدولت وہ منصوبہ مؤخر ہوگیا۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا ملاں نظام

الدین نے اپنے والد گرامی کے مجوزہ نصاب تعلیم میں کچھ اضافہ کر کے اسے رائج کر دیا لیکن ملاں نظام الدین نے اپنے دور کے رجحانات اور تقاضوں کے پیش نظر اس نصابِ تعلیم کو مدون کیا تھا وہ دور چونکہ مناظروں اور علمی مباحث کا دور تھا۔ عمومی طور پر عقائد اور علم کلام کے مسائل اہل علم کے موضوع سخن رہتے تھے اس لیے اس نصابِ تعلیم میں منطق، فلسفہ اور علم کلام پر زیادہ زور دیا گیا جبکہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ پر نسبتاً کم زور دیا گیا۔

دینی مدارس کے نصاب و نظام کا تنقیدی جائزہ

آج ہمارے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں قواعد کی بے شمار کتب پڑھائی جاتی ہیں جن میں نحو میر، صرف میر، علم الصیغہ، فصول الکبریٰ، ہدایۃ النحو کافیہ، شافیہ، شرح جامی اور النحو الواضح وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں۔ ان سب کتب کے پڑھانے کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ طلباء عربی گرائمر سے واقفیت کے ساتھ ساتھ عربی عبارت اعراب کے ساتھ صحیح پڑھنے کے قابل ہوسکیں لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قواعد رٹ تو لیتے ہیں لیکن ان کی عدم مشق اور اجراء نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تحصیل کے مقصود یعنی صحیح عربی عبارت پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یعنی قواعد کی درجن بھر کتب پڑھ لینے کے باوجود طالب علم دو چار فقرے عربی میں لکھنے یا عربی میں گفتگو کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں پورے قرآن مجید کا اردو ترجمہ بھی شامل نہیں ہے۔ تفسیری حوالے سے تفسیر جلالین اور بیضاوی کے چند پارے پڑھا دیئے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک طالب علم دس بارہ سال مدرسہ میں لگانے کے باوجود پورے قرآن مجید کا صحیح اُردو ترجمہ کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ ان کے تفسیری نکات بیان کر سکے۔ اس سلسلہ میں اصل معاون عربی ادب کی کتب ہوسکتی ہیں لیکن ایسی کتب موجودہ درسِ نظامی میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس

نصابِ تعلیم کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ فقہ کی کئی کتب شامل نصاب ہونے کے باوجود طالب علم جدید فقہی مسائل اور ان کا حل جاننے کے حوالے سے کورے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہی کتب کے ہزار ہا صفحات غلامی کے مسائل سے بھرے پڑے ہیں۔ طالب علم غلاموں کی بیع وشراء اور ان کے عتاق ومکاتبت کے مسائل میں ہی الجھا رہتا ہے جن کا عملی زندگی کے ساتھ ذرہ برابر بھی تعلق نہیں ہے۔ پھر ہر فقہی کتاب سال کے آغاز میں کتاب العبادات سے شروع کروائی جاتی ہے۔ نماز، روزہ اور حج وزکوٰۃ کے مسائل پڑھ لینے کے بعد معاملات کا حصہ پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آتی کہ سال ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے سال نئی فقہی کتاب کا آغاز پھر کتاب العبادات سے کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً طلباء دس بارہ سال فقہی کتب سے متعلق رہنے کے باوجود نظامِ تعزیرات، نظام میراث اور نظام مالیات کی اساسیات سے بھی واقف نہیں ہوتے اور عملی زندگی میں زیادہ تر واسطہ چونکہ انہیں مسائل سے پڑھتا ہے اور ان سے عدم واقفیت کی بناء پر دینی طلباء معاشرے میں جاندار کردار ادا نہ کرنے کی وجہ سے ''سیکنڈ لائن'' پر آجاتے ہیں۔ اسی پہلو کو ایک دوسرے تناظر میں دیکھیں تو حیرانگی کی انتہا ہو جاتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں عالمی تاریخ، اسلامی تاریخ، جغرافیہ اور تقابل ادیان کی کتب شامل نصاب ہی نہیں ہوتیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دورہ حدیث کر لینے کے باوجود ہمارے طلباء تاریخ وجغرافیہ اور مذاہب عالم کے بنیادی علم سے بھی محروم رہتے ہیں اور جہاں تک حدیث کا تعلق ہے پورے نصابِ تعلیم میں ابتدائی سالوں میں ریاض الصالحین اور مشکوٰۃ شریف اور موطا امام مالک جبکہ دورہ حدیث شریف میں صحاح ستہ کی کتب کے ابتدائی ابواب پڑھا دیئے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی دینی مدرسہ ایسا ہو جہاں صحاح ستہ مکمل پڑھائی جاتی ہوں۔ اصولِ حدیث اور اصول فقہ کی کتب بعض مدارس میں ہیں تو بعض میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نصاب

تعلیم کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے تصوف کی کتب جن کے مطالعہ سے انسان کو معرفت نفس اور عرفان خدا نصیب ہوتا ہے اور جن کتب کا مطالعہ طالب علم کے علم کو نافع بنا کر اسے علم صالح پر ابھارتا ہے ایسی کتب سرے سے شامل نصاب ہی نہیں ہیں۔ اخلاقیات اور طہارت نفس کا علم تو ان کتب کے مطالعہ سے ہی حاصل ہونا تھا لیکن ان کتب کا مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے طلباء اعلیٰ اخلاقی وروحانی اقدار سے محروم رہتے ہیں اس کے علاوہ ان عبقری اسلامی شخصیات کے افکار کا مطالعہ جنہوں نے اپنی فکر کی جولانیوں سے حالات کے دھاروں کا رُخ بدل کر رکھ دیا تھا۔ شامل نصاب نہیں ہے مثلاً حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ جیسی شخصیات جن کے افکار کا مطالعہ طالب علم کی فکری جہت کے تعین اور اس کے استحکام میں مدد دیتا ہے۔ دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کے اور بھی ایسے پہلو ہیں جن کی طرف مقالہ کی طوالت کے خوف سے میں اشارہ نہیں کر رہا۔

تاہم اس ساری بحث کو اگر ایک اور تناظر میں دیکھا جائے تو قدرے اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ پہلے پچاس ساٹھ سال سے بعض دینی مدارس میں نصابِ تعلیم کی تبدیلی کا ایک رجحان پید ہوا ہے۔ جس کی ابتداء حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے کی تھی کہ آپ نے دینی مدارس کے نصاب میں جدید علوم کو شامل کر کے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف پیش رفت فرمائی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وفاقی وزیر مذہبی امور ڈاکٹر محمود غازی نے ایک میٹنگ میں بعض علماء کے اس سوال پر کہ دینی مدارس میں دینی و دنیوی علوم اکٹھے کیسے پڑھائے جا سکیں گے؟ کے جواب میں فرمایا تھا کہ بھیرہ شریف کا نصابِ تعلیم ہمارے لیے نمونہ ہے کہ وہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری و دنیوی تعلیم بھی دی جاری ہے۔ میرے نزدیک بھیرہ شریف کے نصابِ تعلیم میں جدت اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کی طرف پیش رفت مزید جاری رہنی

چاہیے۔بھیرہ شریف کے اختیار کردہ منہج کو نصابِ تعلیم کے حوالے سے بعض تبدیلیوں کے ساتھ منہاج القرآن نے بھی اپنایا ہے اور اب محی الدین اسلامی یونیورسٹی (جس کے نصابِ تعلیم کی ترتیب و تدوین کے حوالے سے راقم الحروف نے بھی تجاویز بھیجی تھیں) میں مزید جدت کے ساتھ اس منہج کو اپنایا جارہا ہے۔اب آتے ہیں دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کے ان پہلوؤں کی طرف جن کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

دینی مدارس کے نظام وطریقہ تعلیم کے اصلاح طلب پہلو

میرے نزدیک دینی مدارس کے نظام تعلیم میں بے شمار پہلو اصلاح کے قابل ہیں۔مختلف مدارس میں ایک ہی فکر کے حال لوگ ہونے کی وجہ سے فارغ التحصیل طلباء میں ''یک رخاپن'' پایا جاتا ہے۔یعنی دینی مدارس میں مسلکی مسائل نہ صرف پڑھائے، سمجھائے بلکہ رٹائے جاتے ہیں۔جن میں نور و بشر، حاضر و ناظر، دعا بعد نمازِ جنازہ اور دسواں و چالیسواں کے جواز و عدم جواز جیسے دیگر بے شمار مسائل شامل ہیں۔بریلوی مکتب فکر کے مدارس میں ان مسائل کے جواز اور دیوبندی مکتب فکر کے مدارس میں ان کے عدم جواز پر زور دیا جاتا ہے جبکہ وہابی اور اہل حدیث حضرات کے مدارس میں صورتِ حال اس سے بھی بھیانک ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طالب علم بلند فکری سے محروم ہو کر سطحی سوچ کا مالک بن جاتا ہے وہ فارغ التحصیل ہو کر خطابات جمعہ اور دیگر جگہوں پر انہی مسائل کو نہ صرف بیان کرتا ہے بلکہ اچھالتا ہے جس سے فرقہ واریت کا زہر آلود درخت مزید پھلتا پھولتا ہے اور دس بارہ سال دینی مدرسہ میں پڑھنے والا طالب علم اپنی صلاحیتوں کو قوم وملت کی ترقی کیلئے صرف کرنے کی بجائے اپنے مسلک وعقیدہ کے استحکام کیلئے کھپا دیتا ہے اور بدبختی یہ ہے کہ دوسرے مسلک وعقیدہ کے لوگوں کو قتل کرنے کو جہاد اور خود قتل ہونے کو شہادت سمجھتا ہے۔کاش دینی مدارس کے نظامِ تعلیم میں اس پہلو کی اصلاح کر کے طلباء کو عالم کفر کی

مسلم امہ کے خلاف ریشہ دوانیوں سے واقف کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں عالم اسلام کی بیداری کے وسائل سے آگاہ کیا جائے۔ طلباء کو ملت اسلامیہ کے زوال کے اسباب اور کامیابیوں کے اسباب سے شناسا کیا جائے تاکہ وہ حالات کے ساحل پر امت کی ڈگمگاتی کشتی کو منزل مراد پر پہنچانے کی منصوبہ بندی کر سکیں۔ آج کونسا ایسا دینی مدرسہ ہے جہاں یہودی، عیسائی یا قادیانی مشنری کے ہتھکنڈوں سے واقفیت اور ان کے توڑ کیلئے باقاعدہ تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے اس وقت کسی بھی دینی و اسلامی تحریک کا بنیادی مقصد مسلم امہ کی نشأۃ ثانیہ ہونا چاہیے تھا اور اسلامی تحریک کی بنیاد یہ دینی مدارس ہی ہیں جن کے نظامِ تعلیم و تربیت میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ فکری و روحانی تربیت کا ذکر میں نے بطور خاص اس لیے کیا ہے کہ محض علم سے تو رعونت پیدا ہوتی ہے جو علم میں نافعیت پیدا نہیں ہونے دیتی جبکہ ماضی کے دینی مدرس سے فارغ التحصیل ہونے والا ایک طالب علم عالم بھی ہوتا تھا اور ساتھ عارف کامل بھی۔ اسی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

مقالہ کی طوالت کے خوف سے دینی مدارس کے نصاب و نظامِ تعلیم کے بے شمار پہلوؤں کی نقاب کشائی اور ان کی اصلاح کے پہلوؤں سے چشم پوشی برت رہا ہوں تاہم اس سے دینی مدارس کی معاذ اللہ توہین یا تضحیک قطعاً مقصود نہیں بلکہ یہ وہ زمینی حقائق ہیں جن کا ذکر کرنا میں اپنا قومی دینی اور ملی فرض سمجھتا تھا وگرنہ میرے نزدیک تو اگر دینی مدارس کی مروجہ نصاب و نظام تعلیم کے کمزور پہلوؤں کی حکومت نہیں بلکہ دینی مدارس کے اپنے وفاقوں کے ذریعے اصلاح ہو جائے تو یہی دینی مدارس قوم و ملت کو حالات کے گرداب سے نکال سکتے ہیں اور انہی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء ملت اسلامیہ کی پیشوائی کا فریضہ سرانجام دے کر اس امت کو اقوام عالم کا رہنما بنا سکتے ہیں۔

کتابِ رشد وہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور وسرور اور جذبہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

تفسیر احکام القرآن

مفسر قرآن، علامہ مفتی محمد جلال الدین قادری

آیات احکام کا مفصل لغوی وتفسیری حل اُمہات کتب تفسیر کی روشنی میں

مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

اس لئے یہ کتاب طلباء، علماء، وکلاء، ججز

اور عوام وخواص کے لئے قیمتی سرمایہ

آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی۔ پاکستان

خوشخبری

مشہور و معروف محدث و مفسر حضرت امام حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

کا عظیم شاہکار

تفسیر ابن کثیر 4 جلد

جس کا جدید اور مکمل اردو ترجمہ ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف نے اپنے نامور فضلاء

مولانا محمد اکرم الازہری، مولانا محمد سعید الازہری اور

مولانا محمد الطاف حسین الازہری سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے۔

چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔ آج ہی طلب فرمائیں۔

ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، کراچی۔ پاکستان

فون:۔ 7220479 -042-7221953 فیکس:۔ 042-7238010

042-7247350-7225085

021-2212011-2630411

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین

بھیرہ شریف کی زیرِ نگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر در منثور 6 جلد

زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

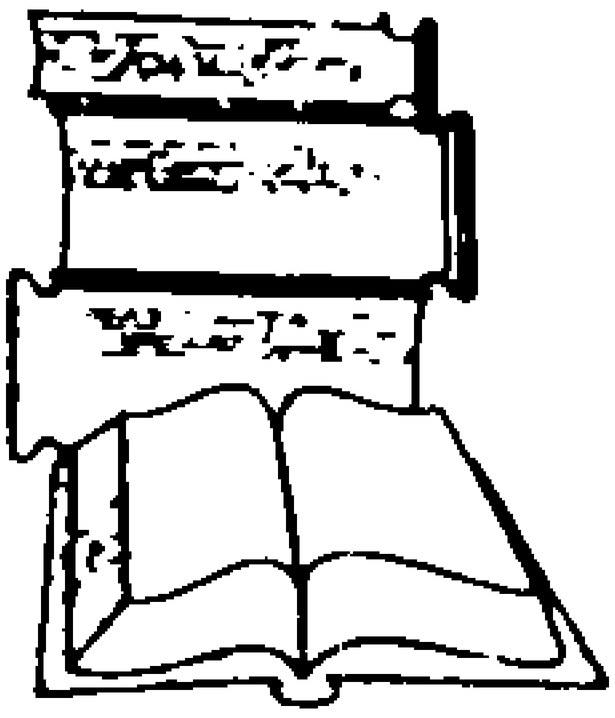

اہل علم کیلئے
عظیم علمی پیشکش

آیات احکام کی تفسیر و تشریح پر مشتمل عصر حاضر کے یگانہ روزگار اور معتبر عالم دین

حضرت علامہ سید سعادت علی قادری کے

قلم سے نکلا ہوا عظیم علمی شاہکار

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

۲ جلدیں

خصوصیات

- زندگی کے تمام شعبوں اور عصر حاضر کے جملہ مسائل کا حل
- متلاشیان علم کے لئے ایک بہترین علمی ذخیرہ
- مقررین و واعظین کیلئے بیش قیمت خزانہ
- ہر گھر کی ضرورت اور ہر فرد کیلئے یکساں مفید

آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

ضیاء القرآن پبلی کیشنز کے تفاسیری کارنامے

تفسیر ضیاء القرآن ۵ جلد

فہم قرآن کا بہترین ذریعہ
اہل دل کے لیے ایک نایاب تحفہ

ترجمہ القرآن جمال القرآن

قرآن پاک کا انتہائی خوبصورت ترجمہ جس کے ہر
لفظ سے اعجاز قرآن کا حسن نظر آتا ہے

تفسیرات احمدیہ
ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر ابن کثیر ۵ جلد
علامہ ابو الفداء عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر خزائن العرفان
صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر سورۃ النساء

تفسیر احکام القرآن
مولانا جلال الدین قادری

تفسیر الحسنات ۷ جلد
ابو الحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر دُرِّ منثور

تفسیر مظہری جلد ۱۰
عارف باللہ حضرت قاضی ثناء اللہ
پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نور العرفان
حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمۃ

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
مفتی سعادت علی قادری

تفسیر بینات القرآن
مفسر: الحافظ القاری
محمد طیب نقشبندی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

- گنج بخش روڈ لاہور 7221953-7220479
  فیکس 7238010
- ۹۔ الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 7225085-7247350
- ۱۴۔ انفال سنٹر اردو بازار کراچی 2210212-2212011
  2630411